کرشن چندر

حیات وادبی جہات

ڈاکٹر رضا احمد رضاؔ

قاسمی کتب خانہ

نہایت ہی معتبر اور
ادب شناس محقق جناب
سلیم سالک صاحب کی خدمت
میں بطور تحفہ۔
Ahmad

کرشن چندر

حیات وادبی جہات

ڈاکٹر رضا احمد رضاؔ

ناشر
قاسمی کتب خانہ

KRISHAN CHANDER : HAYAAT-WA-ADBI JIHAAT

Dr. Raza Ahmed Raza
Ph : 8493836532, 7006827464
Email:Razaamu87@gmail.com

Year of Edition 2022
ISBN: 978-93-83033-75-1

نام کتاب : کرشن چندر: حیات وادبی جہات
مصنف : ڈاکٹر رضا احمد رضا
سن اشاعت : ۲۰۲۲ء
تعداد : ۳۰۰
کمپیوٹر کمپوزنگ : عبدالوحید (مہنڈر، پونچھ)
پرنٹرس : ایچ۔ایس آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی

ملنے کا پتہ:

- قاسمی کتب خانہ، جموں
- ایم۔ایم۔پبلی کیشنز، دہلی
- ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ
- ایم، آر پبلی کیشنز، دہلی
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

Published by
QASMI KUTUB KHANA
E-92, Abul Fazal Enclave, Okhla New Delhi-110025
Talab Khatikan, Jama Masjid, Jammu Tawi 180001
Ph. +91-9797352280 | +91-1913593736
G-Mail:- qasmikutubkhana0729@gmail.com
Email:- info@qasmikutubkhana.store
website:- qasmikutubkhana.store

تعارف

نام : ڈاکٹر رضا احمد رضاؔ

سکونت : مہنڈر (پونچھ) جموں وکشمیر، انڈیا

تعلیم : بی۔اے۔(آنرس اُردو)، ایم۔اے اُردو

پی۔ایچ۔ڈی اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

UGC-NET JRF (URDU)

بی۔ایڈ، ایم۔اے تاریخ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

تصانیف : (۱) ترنم ریاض کی افسانہ نگاری: تنقید وتجزیہ

(۲) کرشن چندر: حیات وادبی جہات

موبائل : 8493836532,7006827464

انتساب

برادرِ اکبر

مرتضیٰ احمد

کی بے لوث محبت وشفقت کے نام

اس شعر کے ساتھ

ظلمت میں بھی مثلِ آفتاب رہا ہے

ہر راہ میں وہ میرا ہم رکاب رہا ہے

فہرست

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقریظ

کرشن چندر ارضی کرب اور رومانی طرز کے ادیب ہیں۔ ان کی تخلیقات میں رومانیت اور حقیقت کا حسین امتزاج اور موثر انداز ہے جو انہیں دوسرے ترقی پسند فکشن نگاروں سے الگ کرتا ہے۔ انہوں نے ماورائیت اور تصوریت کے بجائے اپنے قرب و جوار کی حقیقتوں کو موضوع بنایا نیز ادب کے افادی پہلو پر زور دیا۔ کرشن چندر نے عموماً متوسط طبقے کی عکاسی کی ہے جس میں دھندلی، تنگ اور دم گھٹنے والی فضا، دل برداشتہ چہرے، تھکے ماندے جسم، اداس آنکھیں، خشک ہونٹ اور جھریوں بھرے ہاتھ ضرور ہیں مگر اس حبس زدہ ماحول سے نفرت اور کراہیت کا گمان بھی نہیں گزرتا ہے بلکہ قاری دیر تک اس پر غور کرتا ہے۔

ڈاکٹر رضا احمد رضاؔ نے اس مطمح نگاہ کو اپنی کتاب ''کرشن چندر: حیات وادبی جہات'' میں سلیقے سے اجاگر کیا ہے۔ مصنف نے مذکورہ تناظر و تفکر کے پیش نظر سوانحی کوائف، پرورش اور ذہنی ہلچل کا معروضی مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر رضاؔ کا انداز مدلل ہے جو اس کا غماز ہے کہ کرشن چندر کا ڈکشن سبک اور over sweet ہے۔ فکشن نگار کا جمالیاتی زاویۂ نگاہ حسن و عشق تک محدود نہیں ہے کیونکہ فنکار حسن و عشق کے ساتھ زمانہ شناس بھی ہے، دونوں کی نبض پر اس کی مضبوط گرفت ہے۔ فکر اور لہجہ کی تشکیل میں نفاست اور گہرائی ہے جو دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔

ڈاکٹر رضا احمد رضاؔ کے اس کام کی اہمیت دور حاضر میں اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے کرشن چندر کے اسلوبیاتی مطالعے میں گوجری اور پہاڑی لفظوں کی تعبیر و

تفسیر کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تقابلی مطالعہ سے بھی گریز نہیں برتا ہے۔اس اعتبار سے یہ کتاب کرشن چندر شناسی کے کئی در وا کرتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ادبی حلقے میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

صغیر افراہیم

پیش لفظ

اس مادی دنیا میں کسی بھی تاریخی پہلو، حادثے یا واقعے کے حوالے سے ہمیں اختلافات دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہ دنیا کے ہر معاملے، حادثے، واقعے یا تاریخی پہلو پر سبھی لوگوں کا متفق ہونا ناممکن ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی نیز ادب سے جڑے معاملات اور زبان وادب کے تاریخی پہلوؤں کے حوالے سے بھی ہمیں اختلافات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ بات صدفی صد درست ہے کہ ہر انسان کا کسی ایک ہی بات یا نظریے پر اتفاق کر لینا ممکن نہیں۔ اس طرح انسانی معاشرے میں اختلافات کی اہمیت مسلم ہے اور اس سے انکار حقیقت سے فرار کے مترادف ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان سبھی اختلافات کی گنجائش وہاں ہوتی ہے جہاں ہمیں کسی بات، کسی تاریخی پہلو یا کسی معاملے کے حوالے سے مستند ثبوت میسّر نہ ہوں۔ اگر ہمیں اپنے موضوع کے حوالے سے کوئی مستند ثبوت مل رہا ہے تو میرا خیال ہے کہ ایسے موقعے پر اختلافات کو ختم کرتے ہوئے مستند ثبوت کی بنیاد پر کسی مثبت وممکن نتیجے پر متفق ہونا بھی لازمی ہے۔

اردو ادب میں یا ادبی تاریخ میں بھی ہمیں قدم قدم پر اختلافات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دراصل اردو میں دو قسم کے اہل قلم یا محقق دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان میں ایک تو وہ اہل قلم یا محقق ہیں جو بالکل غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے حقائق کو مستند ثبوتوں کی بنیاد پر سامنے رکھتے ہیں یا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے قلم کار یا محقق جہاں مستند ثبوتوں کے حصول میں ناکام ہوتے ہیں وہاں یہ اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور ایسی جگہ یہ اپنا کوئی قطعی فیصلہ بھی نہیں سناتے نیز تحقیق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس کے برعکس اردو ادب میں ایسے بھی بہت سے قلم کار و محقق دیکھنے کو ملتے ہیں جو کسی موضوع پر تحقیق سے پہلے ہی اپنے ذہن میں یہ طے کر لیتے ہیں کہ انہیں کیا فیصلہ سنانا ہے اور کیا نتائج سامنے لانے ہیں۔ ایسے حضرات کو نہ ہی کسی مستند ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ

ہی ایسے مصنف و محقق کو تحقیق کے اصول وضوابط کا خیال ہوتا ہے۔ ایسے محققین اپنی ذاتی پسند ناپسند یا کسی خاص جانبداری کی بنیاد پر اپنا نظریہ قائم کر لیتے ہیں اور اپنے اسی نظریے کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے میرا ماننا تو یہ ہے کہ کسی معتبر سے معتبر انسان کے منہ سے بھی نکلنے والی ہر بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ بقول استاد محترم پروفیسر سیّد محمد امین میاں قادری ''اس دنیا میں کلام اللہ کے علاوہ انسان کے ہر کلام میں خامیاں ممکن ہیں کیونکہ یہ تقاضائے بشری ہے''۔

کرشن چندر اردو نثر میں ایک نامور اور قد آور فنکار کا نام ہے جس کے ذکر کے بغیر اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ اور غیر افسانوی ادب کی تاریخ دونوں نامکمل ہیں۔ کرشن چندر کی حیات، ان کی ادبی خدمات اور ان کی فنی خصوصیات پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، بے شمار سیمینار کرائے جا چکے ہیں اور ان کی حیات و ادبی خدمات کے حوالے سے کئی مستند علماء و محققین اپنے خیالات کا تفصیلاً اظہار کر چکے ہیں۔ ان کی حیات اور ادبی خدمات کے حوالے سے اس قدر تنقیدی و تحقیقی کام ہونے کے باوجود بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حوالے سے ابھی بھی چند پہلو تشنہ ہیں جو مزید تحقیق و وضاحت کا تقاضا کرتے ہیں۔ میں نے اس حوالے سے ان ہی تشنہ پہلوؤں کی تشنگی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب کرشن چندر کی حیات اور فنی خصوصیات کے حوالے سے اردو داں طبقے میں رائج غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرے گی اور کرشن چندر شناسی کے حوالے سے نئے در بھی وا کرے گی۔ یہ کتاب میری ان امیدوں پر کس حد تک پوری اترتی ہے یا کرشن چندر شناسی میں کس حد تک مددگار ثابت ہوتی ہے اس بات کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کے حوالے سے پہلی بات یہ عرض کرتا چلوں کہ یہاں اختصار کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آج اردو کے قارئین

کسی طویل تحریر کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے جس کی وجہ سے میرے اندازے کے مطابق آج اردو کی پچاس فی صد سے زائد کتب مطالعے سے محروم ہیں۔ یہ مسئلہ اہل اردو کے لیے قابل فکر ہے۔شاید ہماری یہی خامیاں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یقیناً ہماری اس قسم کی خامیاں ہی اردو کے زوال کے اسباب ہیں۔دوسری خاص وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے جو چیزیں لکھی جا چکی ہیں انہیں یہاں تفصیلاً دہرانا بے سود ہوگا۔ایک خاص بات یہ بھی عرض کرنا اہم محسوس ہوتی ہے کہ جس مہنڈر و پونچھ میں کرشن چندر کی ولادت ہوئی، ان کا بچپن ولڑکپن گزرا اور ان کے طالب علمی کے شب وروز گزرے اسی مہنڈر و پونچھ سے میرا بھی تعلق ہے۔لہٰذا جب میں نے کرشن چندر کو تفصیلاً پڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ ان کی نہیں بلکہ میری داستان حیات ہے (میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے) جس کی وجہ سے میرے ذہن میں ان کی حیات و تخلیقات کے حوالے سے خاص دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہاں میں کوئی بڑا دعویٰ نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جس طرح میں نے کرشن چندر کی تخلیقات کو پڑھا، سمجھا اور محسوس کیا ہے اس طرح شاید بہت کم لوگوں نے پڑھا، سمجھا اور محسوس کیا ہوگا۔میری اس بات کے کئی دلائل اس کتاب میں موجود ہیں۔

زیر نظر کتاب کے تعارف کے حوالے سے عرض کرتا چلوں کہ اس کتاب کو مختصراً تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دونوں ابواب میں ضرورت کے مطابق ذیلی عنوانات بھی دیے گئے ہیں۔ پہلا باب ''حیات اور ادبی پس منظر'' ہے۔اس باب میں تاریخ ولادت ووفات، جائے ولادت ووفات، والدین، خاندان، وطن، تعلیم وتربیت، ذہنی وفنی سفر، ارضیت سے وابستگی اور دیگر سوانحی کوائف کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کرشن چندر کی حیات کے مذکورہ پہلوؤں کے حوالے سے رائج غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔دوسرا باب ''اردو فکشن میں انفرادی خصوصیات'' ہے۔اس

باب میں عمومی طور پر ان کی تخلیقات میں اور خصوصی طور پر افسانوی ادب میں موجود ان کی انفرادی خصوصیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں ان کی فنی و موضوعاتی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے عمومی طور پر اردو نثر میں اور خصوصاً اردو فکشن میں ان کی انفرادیت وعظمت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں ایک فرہنگ تیار کی گئی ہے جو کرشن چندر کی تخلیقات کی تفہیم کے حوالے سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ کرشن چندر نے اپنی تخلیقات میں خطہ پیر پنجال اور ریاست پونچھ (کرشن چندر کے زمانے میں پونچھ ایک ریاست تھی۔ تقسیم ہند اور تقسیم کشمیر کے ساتھ ساتھ ریاست پونچھ بھی تقسیم ہوگئی۔ ریاست پونچھ کا آدھا حصہ اب پاکستان کے قبضے میں ہے۔ اب پونچھ کی حیثیت محض ایک ضلع کی ہے) کی مقامی زبانوں گوجری اور پہاڑی کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے جن کی تفہیم عام قاری کے لیے مشکل ہے۔ اس فرہنگ میں گوجری و پہاڑی زبانوں کے ایسے الفاظ کو جمع کر کے ان کے معانی کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کرشن چندر شناسی کے حوالے سے یہ کام نیا بھی ہے اور خاص اہمیت کا حامل بھی ہے۔

انسان کے کسی بھی کام میں خامی یا کوتاہی کا پایا جانا عین ممکن ہے کیونکہ یہ تقاضائے بشری ہے۔ اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ میری اس کتاب میں خامیاں ہوں کیونکہ میں بھی ایک انسان ہوں اور مجھ سے بھی خطا ہوسکتی ہے اس بات کا میں اعتراف کرتا ہوں۔ علاوہ ازیں اگر کوئی شخص اس کتاب میں پیش کردہ مواد یا کرشن چندر کے حوالے سے میرے خیالات ونظریات سے اختلاف رکھتا ہے تو اسے اختلاف کا پورا حق ہے کیونکہ اختلافات نظریات سے ہوتے ہیں ذات سے نہیں۔ بہر حال قارئین سے یہ التماس رہے گی کہ کتاب پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات سے ضرور آگاہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک صفات کی بارگاہ میں سر بہ خم شکر ادا کرتا ہوں کہ جس

نے مجھے اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کا حوصلہ بخشا ورنہ یہ طے ہے کہ قادر مطلق کی رضا کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ ساتھ ہی میں ان تمامی اساتذہ کرام، عزیز واقارب اور رفقاء کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں ہر ممکن تعاون کیا۔

ڈاکٹر رضا احمد رضاؔ

۲۰ اگست ۲۰۲۲

حیات اور ادبی پس منظر

اردو زبان وادب کے فروغ میں جہاں ایک طرف بہت سی تحریکوں اور اداروں کا ہاتھ رہا ہے وہیں دوسری طرف بہت سی شخصیات نے بھی اس روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے جو کسی تحریک سے کم نہیں۔ کچھ اداروں اور تحریکوں کے نام تو تاریخ اردو ادب میں برائے نام ہیں جن کا ذکر نہ کیا جائے تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن کچھ تحریکیں اور ادارے ایسے ہیں جن کا ذکر کیے بغیر تاریخ اردو ادب نامکمل ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ بھی برائے نام ادیب ہیں ادبی تاریخ میں جن کا ذکر کرنا یا نہ کرنا برابر ہے لیکن ہمارے ہاں بہت سے ایسے ادیب بھی ہیں جو اپنے آپ میں ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں نیز ایسے ادیبوں کے بغیر ادب کی تاریخ نامکمل ہے۔ ایسے ہی نامی گرامی ادیبوں میں ایک اہم نام کرشن چندر کا بھی ہے جن کے ذکر کے بغیر اردو کی ادبی تاریخ اور خصوصاً اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ نامکمل ہے نیز اردو میں غیر افسانوی نثر کے حوالے سے بھی کرشن چندر کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں کرشن چندر کے والدین، وطن، حیات، زندگی اور طرز زندگی کا اختصار کے ساتھ احاطہ کرتے ہوئے اس سیاسی، سماجی اور معاشرتی پس منظر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے جس نے اس عظیم فنکار کو فن کی طرف راغب کیا یا کچھ لکھنے کے لیے متاثر کیا اور کرشن چندر کو ایشیاء کا عظیم افسانہ نگار بننے کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔

والدین، خاندان اور وطن

کرشن چندر کے والد کا نام گوری شنکر چوپڑہ تھا جو ذات کے کھتری ہندوں تھے اور پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ ان کا آبائی وطن شہر وزیر آباد، مغربی پنجاب (گوجراں والا) تھا جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ ان کے والد نوکری کے سلسلے میں آبائی وطن کو چھوڑ کر بھرت پور (راجستھان) میں قیام کرنے لگے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تبادلہ

یکے بعد دیگرے مہنڈر اور پونچھ میں ہوتا رہا۔ لہٰذا کرشن چندر کو کبھی بھی وزیر آباد میں قیام کرنے کا موقع نہیں ملا اور نہ ہی ان کے والدین نے ان کی ولادت کے بعد اپنے آبائی وطن میں مستقل قیام کیا۔ کرشن چندر کی والدہ کا نام پرمیشوری دیوی تھا جو کہ ایک محتاط ماں، دانش مند بیوی اور ذمہ دار گھریلو عورت تھیں۔ کرشن چندر کے والد بے حد مہربان، شریف النفس، مشفق، مخلص اور ملنسار انسان ہونے کے ساتھ ساتھ عاشق مزاج بھی تھے اور گوشت خوری و شراب نوشی کے بھی شوقین تھے۔ ان کے والد مذہب یا ذات پات کے نام پر کسی بھی تفریق کو گوارا نہیں کرتے تھے نیز مذہبی اعتبار سے بے حد اعتدال پسند اور روشن خیال انسان تھے۔ ان کے ہاں مذہب اور ذات پات سے زیادہ انسان و انسانیت کی خاص اہمیت تھی۔ اس کے برعکس کرشن چندر کی والدہ کا مزاج ان کے والد سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی والدہ خوددار، ہر اعتبار سے ہوشیار، گھریلو معاملات میں بے حد فعال، بچوں کے حوالے سے محتاط، اصول و قوانین کی پابند اور ڈکٹیٹر مزاج کی خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ تیز و تند مزاج اور تلخ و ترش زبان کی حامل تھیں۔ اس کے علاوہ ان کی والدہ تمامی مذہبی رسوم و قیود کی مکمل پاسدار بھی تھیں۔ اس بات کا اندازہ ان کی اس خاصیت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کرشن چندر کی والدہ اپنے خاوند یعنی ڈاکٹر صاحب کو گوشت خوری اور شراب نوشی کی اجازت کبھی نہیں دیتی تھیں جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب یہ دونوں کام ان سے چھپ کر کرتے تھے۔

ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ اور پرمیشوری دیوی کے ہاں پانچ بچوں نے جنم لیا جن میں چار بچے اور ایک بچی شامل ہیں۔ بیٹوں کے نام کرشن چندر، مہندر ناتھ، بھوشن (بھوشن نامی بچہ چھے سال کی عمر میں ہی فوت ہو گیا تھا) اور اوپندر ناتھ ہیں جبکہ بیٹی کا نام سرلا دیوی ہے۔ سبھی بہن بھائیوں میں کرشن چندر سب سے بڑے تھے۔ ان کے والدین انہیں کا کا کہہ کر پکارتے تھے اور مہندر ناتھ کو چھوٹا کا کا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ (کا کا پنجابی

زبان میں کم عمر بچے کو اور کا کی کم عمر بچی کو کہا جاتا ہے)۔ یہ سبھی بچے اپنے والد یعنی ڈاکٹر صاحب کو''باؤ جی'' اور والدہ کو''ماں جی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی طرح چھوٹے بہن بھائی کرشن چندر کو''بھائی جی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ کرشن چندر چھوٹے بھائی مہندر کو ''مہندر جی'' کہا کرتے تھے اور اوپندر ناتھ کو پیار سے''اوم'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

ولادت اور سوانحی کوائف

کرشن چندر کی پیدائش کے حوالے سے محققین میں اختلاف رائے ہے نیز اس اختلاف کی نوعیت زمانی بھی ہے اور مکانی بھی ہے۔ اس حوالے سے یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ اکثر علمی وادبی اور تعلیمی حلقوں اور اداروں میں بھی کرشن چندر کی تاریخ پیدائش اور جائے ولادت غلط لکھی اور بتائی جاتی ہے جسے ہم ادبی تاریخ کے المیے سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کرشن چندر نے زندگی کا خوبصورت اور خاص حصہ (بچپن اور لڑکپن) ریاست پونچھ (پونچھ کرشن چندر کے وقت ریاست تھی جو کہ اب جموں وکشمیر کا ایک ضلع ہے) میں گزارا ہے۔ کرشن چندر کی کئی تحریروں سے پونچھ کے تیئں ان کی محبت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کرشن چندر کی پونچھ کے ساتھ محبت اور نسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے جموں وکشمیر کی ریاستی سرکار نے ماضی قریب میں ہی (۲۰۲۱ء کے آخر میں) گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ کا نام بدل کر کرشن چندر کالج پونچھ رکھا ہے۔ یہ ہمارے لیے، اہل پونچھ کے لیے اور اہل ادب کے لیے صرف خوشی کا ہی نہیں بلکہ فخر کا مقام ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مقامی انتظامیہ نے اور کالج کے ذمہ داران حضرات نے کالج کے نئے طے شدہ نام کی تختی نصب کرتے وقت وہاں بھی ان کی تاریخ پیدائش (۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء درج کی گئی ہے) غلط درج کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اکثر محققین اور کرشن چندر شناسی کے ماہرین نے ان کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے حوالے سے غلط بیانی کی ہے۔ اس لیے جن لوگوں نے ان کی پیدائش کے بارے

میں اپنی رائے دی ہے سب سے پہلے یہاں ان اہل قلم کے خیالات ونظریات پر ایک نظر ڈالنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ جیلانی بانو نے کرشن چندر پر ایک مونو گراف تحریر کیا ہے جسے ساہتیہ اکادمی دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ان کی پیدائش کے حوالے سے جیلانی بانو لکھتی ہیں :

''کرشن چندر وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ پاکستان) میں ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ وہاں ان کے والد گوری شنکر ڈاکٹر تھے'' ۱؎

کرشن چندر شناسی کے حوالے سے جگدیش چندر ودھاون کا نام ومقام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کرشن چندر کی پیدائش کے حوالے سے جگدیش چندر ودھاون کا نظریہ جیلانی بانو سے مختلف ہے۔ اس حوالے سے جگدیش چندر ودھاون اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

''کرشن چندر ۲۳ نومبر ۱۹۱۳ء کو بھرت پور (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد میڈیکل آفیسر کے طور پر ملازم تھے۔'' ۲؎

اسی طرح نند کشور وکرم کا نام بھی کرشن چندر شناسی کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کرشن چندر کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے نند کشور وکرم کا نظریہ مذکورہ دونوں نظریات سے مختلف ہے۔ ان کی پیدائش کے حوالے سے نند کشور وکرم لکھتے ہیں :

''میرا خیال ہے کہ مہندر ناتھ کی تحریر کردہ جائے پیدائش درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ ان دنوں ریاست بھرت پور میں ملازم تھے۔ ان تمام تاریخوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی ولادت ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء بمقام بھرت پور کچھ حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اور اب اسی کو صحیح مانا جاتا ہے۔'' ۳؎

اسی طرح ان کی پیدائش کے حوالے سے دوسری جگہ نند کشور وکرم یوں لکھتے ہیں :

نام		:	کرشن چندر

ولادت		:	۲۳نومبر۱۹۱۴ء (بحوالہ تذکرہ ماہ وسال از مالک رام)

جائے ولادت:	بھرت پور، راجستھان (ان کے والد گوری شنکر چوپڑہ وہاں بحیثیت ڈاکٹر تعینات تھے)

آبائی وطن	:	وزیرآباد شہر (مغربی پنجاب) ۴

نند کشور وکرم نے مالک رام اور تذکرۂ ماہ وسال کا حوالہ دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہاں تذکرۂ ماہ وسال میں درج مالک رام کا نظریہ بھی سامنے رکھا جائے۔ مالک رام کا نظریہ بھی دیگر نظریات سے ذرا مختلف ہے۔ انہوں نے ''تذکرۂ ماہ وسال'' میں کرشن چندر کی تاریخ ولادت ووفات اور جائے ولادت ووفات اس طرح درج کی ہیں:

''کرشن چندر (افسانہ نگار)

ولادت: وزیرآباد (پاکستان) دوشنبہ ۲۳نومبر۱۹۱۴ء

وفات: بمبئی (اسپتال) سہ شنبہ ۸ مارچ ۱۹۷۷ء ۵

مذکورہ خیالات ونظریات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کرشن چندر کا آبائی وطن تو وزیرآباد (مغربی پنجاب) ہی تھا لیکن جب کرشن چندر کی ولادت ہوئی اس وقت ان کے والد بھرت پور (راجستھان) میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ لیکن کرشن چندر کی ولادت کب اور کہاں ہوئی اس حوالے سے اوپر پیش کیے گئے مختلف نظریات میں کافی اختلاف ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ مذکورہ نظریات میں سے کوئی ایک نظریہ بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ کیوں کہ یہاں کسی بھی کرشن چندر شناس نے کسی مستند ثبوت کی بنیاد پر بات نہیں کی بلکہ اپنی ذاتی پسند ناپسند کی بنیاد پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے حوالے سے میں یہاں مستند ثبوتوں کی بنیاد پر بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس حوالے سے اگر ہمیں خود کرشن چندر کی تقریر وتحریر

سے کوئی ثبوت یا سُراغ ملتا ہے تو اسے بنیادی اہمیت دینی چاہیے۔ کرشن چندر نے سہیل عظیم آبادی کے نام بہت سے خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے ۴۳ خطوط رسالہ ''شاعر''، ممبئی (کرشن چندر نمبر ۷ ۱۹۶ء) میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک خط میں انہوں نے اتفاقاً اپنی تاریخ پیدائش کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ خط کچھ اس طرح ہے :

''۲۰ر دسمبر ۵۳ء

پیارے سہیل .... بہار یونیورسٹی کے ایف۔ اے اُردو کے نصاب کے لیے تم جو میری کہانی پسند کرو گے اسے بخوشی شامل کرسکتے ہو۔ اس میں پوچھنے کا اور دوسری بار خط لکھنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا ہے۔ بہر حال اب پیدا ہوگیا ہے تو جواب دے رہا ہوں۔ میری تاریخ پیدائش ۱۹ر نومبر ۱۹۱۳ء ہے ۔ عمر چہل سال۔ زندگی کچھ کتابوں میں اور کچھ کوئے بتاں میں گزری ہے جس کا ذکر یونیورسٹی کے طالب علموں کے لیے خطرناک ثابت ہوگا .... تمہارا کرشن چندر'' [۶]

مجھے لگتا ہے کہ مذکورہ خط کو پڑھنے کے بعد کرشن چندر کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیوں کہ تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ کسی شخصیت کی تقریر وتحریر کو ہی بنیادی اہمیت دی جائے۔ جہاں تک جائے ولادت کا مسئلہ ہے تو اس حوالے سے بھی محققین میں اختلاف رائے ہے۔ کوئی ان کی جائے ولادت بھرت پور راجستھان بتا رہا ہے تو کوئی وزیر آباد (گوجرانوالا) بتا رہا ہے۔ اس حوالے سے مجھے کرشن چندر کی تحریر وتقریر سے کوئی مستند ثبوت نہیں ملا لیکن انہوں نے اپنی ولادت پونچھ میں ہونے کی طرف اپنے سوانحی ناول ''میری یادوں کے چنار'' میں اشارہ ضرور کیا ہے۔ یہاں کرشن چندر کی زبانی یہ اقتباس بھی خاص اہمیت کا حامل ہوگا:

"میری ماں نے بالکل بے بس اور مجبور ہو کر دوبارہ اپنے ہرے بھرے گھر کی طرف دیکھا۔ دن رات کی ایک ایک لمحے کی محنت سے انہوں نے یہ گھر سجایا تھا۔ اس گھر میں ان کی پوجا کا کمرہ تھا۔ ان کا خوبصورت کچن تھا۔ اس گھر میں وہ کمرہ تھا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ اس گھر میں ان کے صوفے تھے پلنگ تھے الماریاں تھیں آئینے تھے پردے تھے ٹیبل لیمپ تھے۔" ۷

یہاں کرشن چندر پونچھ کے حوالے سے بات کر رہے ہیں جب ان کے والد کو مہاراجہ پونچھ کی طرف سے چوبیس گھنٹوں میں پونچھ کا احاطہ چھوڑ دینے کا حکم ملتا ہے۔ کرشن چندر کی زبانی اس اقتباس سے ان کی جائے ولادت کی طرف صاف اشارہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ سلمیٰ صدیقی کے ایک انٹرویو کو بھی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر لیاقت جعفری نے کرشن چندر اور پونچھ کے حوالے سے سلمیٰ صدیقی کا ایک ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا تھا جو یوٹیوب پر بھی موجود ہے۔ اس انٹرویو میں کی گئی گفتگو کے ذریعے یہ ثابت ہوتا ہے بقول سلمیٰ صدیقی کرشن چندر کی والدہ کا کہنا ہے کہ ان کی ولادت پونچھ میں ہوئی۔ کرشن چندر کی والدہ کے قریبی رشتہ دار پونچھ میں رہتے تھے۔ لہٰذا جب کرشن چندر کی ولادت کا وقت قریب آیا تو ان کی والدہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں پونچھ میں آ گئیں اور یہیں پر کرشن چندر کی ولادت ہوئی۔ مذکورہ انٹرویو میں سلمیٰ صدیقی کی کرشن چندر کی ولادت کے حوالے سے گفتگو کچھ اس طرح ہے:

"کرشن جی، ماں جی، سرلا، وہ سب کہتے ہیں کہ، سب سے زیادہ مہندر کہ، جو میں نے بچپن سے سنا ہے وہ یہ کہ پونچھ میں کرشن جی کی پیدائش ہوئی...... میں نے کہا میں ماں جی سے پوچھتی ہوں۔ میں نے کہا ماں جی آپ بتائیے کاکا کتھے پیدا ہوا (کرشن چندر کے والدین انہیں کاکا کہا کرتے تھے) تو ماں جی کا جواب تھا "اتھے پونچھ" ۸

سلمٰی صدیقی کا کہنا ہے کہ میں نے جب ماں جی (کرشن چندر کی والدہ) سے ان کی جائے ولادت کے حوالے سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جب وہ حمل سے تھیں تو ان کے بھائی یا کوئی رشتہ دار انہیں پونچھ لے آئے تھے اور یہیں پر کرشن چندر کی ولادت ہوئی۔ اس طرح مذکورہ دونوں اقتباسات کی روشنی میں ہمارا اس بات پر متفق ہونا ضروری ہے اور بہ ذات خود بحیثیت ایک طالب علم میرا بھی یہ ماننا ہے کہ کرشن چندر کی ولادت ۱۹/ نومبر ۱۹۱۳ء میں پونچھ میں ہوئی۔ بے شک ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ اس وقت ملازمت کے سلسلے میں بھرت پور میں تھے لیکن ان کی والدہ اس وقت پونچھ آ چکی تھیں۔

۱۵۔۱۹۱۴ء کے آس پاس کرشن چندر کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ ملازمت کے سلسلے میں مہنڈر چلے گئے جو کہ ریاست پونچھ کا ایک خوبصورت خطہ ہے۔ آزادی اور تقسیم ہند سے قبل پونچھ ایک ریاست تھی۔ تقسیم کے بعد پونچھ کا آدھا حصہ پاکستان کے قبضے میں چلا گیا۔ اب پونچھ کی حیثیت ایک ضلعے کی ہے۔ کرشن چندر کی تعلیم کی شروعات مہنڈر سے ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے مہنڈر کے ایک گورنمنٹ اسکول میں پہلی جماعت میں داخلہ لیا۔ پہلی کلاس سے ساتویں تک کرشن چندر نے مہنڈر میں تعلیم حاصل کی نیز اس کے بعد آٹھویں کلاس سے ہائی اسکول تک کی تعلیم کرشن چندر نے وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ سے حاصل کی جواب گورنمنٹ ہائر اسکنڈری اسکول بوائز پونچھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم کے سلسلے میں لاہور چلے گئے۔

لاہور میں کرشن چندر ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۰ء تک مقیم رہے۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے فارمن کرسچن کالج لاہور سے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بی۔ اے کی ڈگری کے لیے داخلہ لے لیا۔ بی۔ اے میں انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق

سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور ادب وغیرہ مضامین کا انتخاب کیا۔ ۱۹۳۳ء میں بی۔اے کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں انگریزی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں اپنے والدین کی خواہش (یہ خواہش والد کی کم اور والدہ کی زیادہ تھی) اور اصرار کے مطابق ایل۔ایل۔بی کا امتحان بھی پاس کیا۔ کچھ عرصہ لاہور میں کنہیا لال کپور کے توسط سے ایک پبلیشر کے ہاں چھوٹی سی ملازمت بھی کی جہاں ڈیڑھ سو روپیے ماہوار ملتے رہے۔ اس طرح کرشن چندر ۱۹۴۰ء تک لاہور میں ہی قیام پذیر رہے۔ ۱۹۳۹ء میں لاہور میں ہی ان کی پہلی شادی ودھیاوتی سے ہوئی۔ ودھیاوتی تعلیمی اعتبار سے انڈر گریجویٹ تھی اور لاہور کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ کرشن چندر کالج کے دور میں کالج سے بھاگ کر بھگت سنگھ کی انقلابی پارٹی میں بھی شامل ہوئے تھے جس کے نتیجے میں انہیں تقریباً دو مہینے کی قید بھی برداشت کرنی پڑی۔ کرشن چندر لاہور کالج میں کالج میگزین کے شعبۂ اردو کے اڈیٹر بھی رہے اور انہوں نے فریدہ بیدی نامی عورت کے ساتھ انگریزی ماہنامہ ''دی ماڈرن گرل'' کی ادارت بھی کی۔

لاہور سے ہی کرشن چندر نے ملازمت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے آل انڈیا ریڈیو لاہور میں بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ کرشن چندر نہ ہی اس ملازمت میں دلچسپی رکھتے تھے اور نہ ہی اس ملازمت سے مطمئن تھے۔ دراصل کرشن چندر آزاد خیال اور آزادی پسند انسان تھے جو سرکاری ملازمت اور انگریزی سرکار کی پابندیوں کو دلی طور پر قبول نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن وقتی طور پر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں یہ ملازمت قبول کرنی پڑی۔ اس حوالے سے جگدیش چندر ودھاون لکھتے ہیں:

> ''نومبر ۱۹۳۹ء میں کرشن چندر کو آل انڈیا ریڈیو لاہور کی جانب سے پروگرام اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت کی پیش کش ہوئی تو

انہیں سخت ذہنی تذبذب کا سامنا کرنا پڑا لیکن سوچ بچار کے بعد
انہوں نے ملازمت قبول کرلی۔''۹

آل انڈیا ریڈیو لاہور میں کرشن چندر کی تقرری پطرس بخاری کی سفارش پر ہوئی تھی۔ ٹھیک ایک سال بعد یعنی ۱۹۴۰ء میں کرشن چندر کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو دلی میں ہوگیا۔ یہاں انہوں نے تیس ہزاری کے علاقے بھارگو لین میں رہائش اختیار کی اور تقریباً ایک سال تک قیام کیا۔ مزید ایک سال بعد یعنی ۱۹۴۱ء میں ان کا تبادلہ دلی سے لکھنؤ بحیثیت ڈراما انچارج کے ہوگیا۔ وہاں ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے تک قیام کیا۔ کرشن چندر زیادہ دیر اپنے ضمیر سے اور اپنے مزاج سے بغاوت نہ کرسکے نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح انہوں نے آل انڈیا ریڈیو میں کل تین سال ملازمت کی۔

کرشن چندر نے ۱۹۴۲ء میں ریڈیو کی ملازمت ترک کردی اور ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی پیش کش قبول کرتے ہوئے شالیمار پکچرز پونا میں چلے گئے اور اپنے آپ کو فلمی دنیا سے جوڑ لیا۔ یہاں ان کے چار سال بڑی عیش وعشرت سے گزرے لیکن زیادہ دیر یہاں بھی قیام نہیں کرسکے۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے شالیمار پکچرز کو بھی خیر باد کہا اور ممبئی ٹاکیز ممبئی میں انچارج اسٹوری ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ یہاں ان کی تنخواہ بھی پندرہ سو روپیہ ماہوار تھی اور مکان کا کرایہ ادا کرنے کی ذمہ داری بھی کمپنی کی تھی لیکن ایک سال ملازمت کرنے کے بعد انہوں نے یہاں سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اس کے بعد کرشن چندر نے اپنی فلم کمپنی ''ماڈرن تھیٹر'' کے نام سے قائم کی اور اپنی دو فلمیں ''سرائے کے باہر'' اور ''راکھ'' بھی بنائیں جو بعد میں زیادہ مشہور نہیں ہوئیں۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۰ء تک انہوں نے بمبئی میں ہی مستقل قیام کیا۔

کرشن چندر نے ۱۹۶۰ء میں ممبئی کو خیر باد کہا اور دلی چلے آئے نیز یہاں دو سال

تک مقیم رہے۔اسی دوران یعنی ۱۹۶۱ء میں کرشن چندر کی دوسری شادی سلمیٰ صدیقی سے بمقام نینی تال ہوئی۔شادی کے بعد دو مہینے نینی تال میں قیام کرنے کے بعد کرشن چندر اور سلمیٰ دلی آ گئے۔اب کرشن چندر مستقل طور پر دلی رہنا چاہتے تھے لیکن حالات نے ساتھ نہیں دیا یعنی مالی حالت نے مجبور کیا اور ۱۹۶۲ء میں دوبارہ ممبئی چلے گئے۔اس کے بعد باقی ماندہ زندگی مستقل طور پر ممبئی میں ہی گزاری۔

۱۹۶۶ء میں کرشن چندر کو سویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔۱۹۶۷ء میں سویت لینڈ رائٹرز یونین کی چوتھی اور ۱۹۷۱ء میں پانچویں کانفرنس میں کرشن چندر کو مدعو کیا گیا جس میں ان کے ساتھ ساتھ سلمیٰ صدیقی نے بھی شرکت کی۔اگست ۱۹۶۷ء میں کرشن چندر اور سلمیٰ ہنگری کی سیاحت کو بھی گئے۔جنوری ۱۹۶۹ء میں انہیں پدم بھوشن کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔نومبر ۱۹۷۳ء میں انہیں نہرو کلچر ایسوسی ایشن لکھنؤ کا ایوارڈ بھی ملا اور ۱۹۷۴ء میں مرکزی حکومت کے فلم ڈویژن نے ان پر ۲۰ منٹ کی ڈاکومینٹری فلم بھی بنائی۔ان کے انعامات واعزازات کی تفصیل جگدیش چندر ودھاون کی زبانی حسب ذیل ہے :

> ''اکتوبر ۱۹۶۶ء میں انہیں سویت لینڈ ایوارڈ ملا۔جنوری ۱۹۶۹ء میں انہیں پدم بھوشن کا خطاب ملا۔نومبر ۱۹۷۳ء میں انہیں نہرو کلچر ایسوسی ایشن لکھنؤ کا ایوارڈ دیا گیا۔۱۹۷۴ء میں فلم ڈویژن نے ان پر ڈاکومینٹری فلم بنائی۔جنوری ۱۹۷۶ء میں وہ آل انڈیا ریڈیو کے Producer Emeritus بنائے گئے اور اپریل ۱۹۷۶ء سے جنوری ۱۹۷۷ء تک دس ماہ وہ ایک ہزار آٹھ سو روپیہ ماہوار پاتے رہے۔مارچ ۱۹۷۷ء میں باندرہ کی ہل روڈ کا نام بدل کر کرشن چندر روڈ رکھا گیا۔''[۱۰]

اس کے علاوہ پونچھ میں جہاں ان کی ولادت بھی ہوئی تھی اور ان کا بچپن بھی گزرا تھا، پونچھ فاؤنٹن پارک کا نام بھی بدل کر کرشن چندر پارک رکھا گیا۔ اور ماضی قریب میں (یعنی ۲۰۲۱ء کے آخری مہینوں میں) جموں وکشمیر کی ریاستی سرکار نے کرشن چندر کی ادبی اہمیت اور پونچھ کے تئیں ان کی محبت نیز پونچھ کے ساتھ ان کے تعلق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ کا نام بدل کر کرشن چندر کالج پونچھ رکھا ہے۔ کرشن چندر نے اپنی زندگی مختلف مقامات پر یکے بعد دیگرے گزاری ہے لیکن اگر ان کو کسی جگہ سے روحانی وابستگی تھی تو وہ کشمیر (یعنی مہنڈر اور پونچھ) سے تھی۔ اس کے بعد انہیں لاہور سے بھی خاص لگاؤ رہا ہے۔

کرشن چندر کے سوانحی کوائف میں اگر سلمٰی صدیقی کا ذکر نہ کیا جائے تو ان کی کہانی زیست نامکمل رہے گی۔ اس لیے کرشن چندر اور سلمٰی صدیقی کے حوالے سے بھی یہاں اختصار کے ساتھ گفتگو لازمی محسوس ہوتی ہے۔ کرشن چندر اور سلمٰی صدیقی کے تعلقات ایک ادیب اور قاری کی حیثیت سے شروع ہوتے ہیں اور بعد میں دونوں ایک دوسرے کے رفیق حیات بن جاتے ہیں۔ کرشن چندر اور سلمٰی صدیقی آپسی ملاقات سے پہلے بھی دونوں شادی شدہ تھے اور ان کی اولادیں بھی تھیں۔ کرشن چندر کی پہلی شادی ۱۹۳۹ء میں لاہور میں ودھیاوتی سے ہوئی تھی جس سے ان کی تین اولادیں تھیں۔ سلمٰی صدیقی کی شادی خورشید عادل منیر سے ہوئی تھی جن سے ان کا ایک بچہ راشد عادل منیر تھا۔ یہ بچہ ان کی شادی کے بعد کرشن چندر اور سلمٰی صدیقی کے ساتھ ہی رہا نیز کرشن چندر نے راشد منیر کو اپنے بچوں کی طرح رکھا۔ جب راشد منیر جوان ہوئے تو کرشن چندر نے ان کی ملازمت بھی لگوائی اور اپنے خرچے پر ان کی شادی بھی کروائی۔ کرشن چندر اور سلمٰی صدیقی دونوں اپنی اپنی ازدواجی زندگی سے نالاں تھے۔ کرشن چندر ایک آزاد ذہن، حسن پرست، رومانی مزاج اور سیاحت پسند انسان تھے جبکہ ان کی پہلی بیوی ودھیاوتی

رسم وروایات کی پابند اور حدود و قیود میں رہ کر انہیں بھی خاص پابندیوں میں جکڑ کر رکھنا چاہتی تھی جو کرشن چندر کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوسری طرف سلمیٰ صدیقی بھی اپنی پہلی شادی سے مطمئن نہیں تھیں بلکہ پہلے شوہر کے ساتھ یہ بہت زیادہ پریشان اور خستہ حال تھیں۔ یہ دونوں کسی ایسے انسان کے متلاشی تھے جو ان کی زندگیوں میں اطمینان لا سکے اور زندگی کو خوشگوار بنایا جا سکے۔ لہٰذا ان دونوں کی ذہنی ونفسیاتی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ ان کی آپسی ملاقات نے ان کی ایک خاص ضرورت یا خواہش کی تکمیل کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ ان دونوں کی نا آسودہ زندگیوں کے بارے میں جگدیش چندر ودھاون یوں رقمطراز ہیں:

> ''جہاں کرشن چندر اپنی ازدواجی زندگی سے نا مطمئن اور نالاں تھے وہیں سلمیٰ کی گھریلو زندگی بھی اپنے شوہر سے ناچاقی کی وجہ سے نا آسودہ اور نا خوشگوار تھی۔ گویا دونوں گردشِ دوراں کے ستائے ہوئے تھے۔ جو قدرِ مشترک جلد ہی ان کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی وہ ان کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔''[۱۱]

کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی کی پہلی ملاقات علی گڑھ میں ہوئی۔ یہاں ایک ادبی محفل میں کرشن چندر تشریف لائے تھے اور سلمیٰ صدیقی علی گڑھ میں ہی رہتی تھیں۔ سلمیٰ صدیقی نے اس ادبی محفل کے اختتام پر سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کرشن چندر سے متاثر ہونے کا بھی اظہار کیا۔ اس کے بعد ان کی باقاعدہ پہلی ملاقات دلّی میں کرشن چندر کے گھر پر ہوئی جہاں سلمیٰ صدیقی اپنے بیٹے راشد منیر کو گود میں لیے اسرار الحق مجازؔ کے ہمراہ گئی تھیں۔ اس کے بعد خط وکتابت اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب یہ سلسلہ عروج پر پہونچا تو سلمیٰ نے خورشید عادل منیر سے طلاق لے لی نیز کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی بمقام نینی تال اسلامی رسوم وقوانین کے تحت شادی کر کے ایک دوسرے

کا سہارا بن گئے۔ کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی کی شادی کے حوالے سے جگدیش چندر ودھاون یوں لکھتے ہیں :

"آخر وہ ساعت سعید آپہونچی جس کا کہ انتظار تھا۔ سات جولائی ۱۹۶۱ء کی شام کو نینی تال میں کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی نے مہارانی صاحبہ جہانگیر آباد پلیس میں اسلامی رسوم کے مطابق شادی کرلی اور ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو گئے۔"[۱۲]

کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی دونوں اس شادی سے صرف مطمئن ہی نہیں تھے بلکہ اس شادی کے بعد ان کی زندگیوں میں ایک بہار سی آ گئی۔ حالانکہ دوسری شادی کے بعد بھی انہیں بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ان کی پریشانیوں کی ایک خاص وجہ ان کی دوسری شادی بھی تھی۔ کیونکہ ایک طرف تو مذہبی شدت پسند ان کی تلاش میں تھے تو دوسری طرف ان کے عزیز و اقرباء بھی اس شادی کے خلاف تھے۔ یہاں تک کہ ان کی پہلی بیوی ودھیاوتی نے بھی ان پر مقدمہ کر دیا تھا لیکن ان دونوں نے ایک دوسرے کو اتنا سہارا دیا کہ کوئی بھی پریشانی ان کے لیے پریشانی نہ رہی۔ اس طرح کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی دونوں اس شادی کے بعد ایک پرسکون اور اطمینان بخش زندگی گزارنے لگے۔

کرشن چندر کی دوسری شادی کے حوالے سے ایک اہم مسئلہ ان کے مذہب کا سامنے آتا ہے۔ کرشن چندر نے ایک ہندو کی حیثیت سے جنم لیا نیز ایک ہندو گھرانے میں ان کی پرورش ہوئی لیکن ان کا ذہن کبھی مذہبی رسوم و قیود کا پابند نہیں رہا۔ بچپن سے ہی کرشن چندر ہندو کم اور انسان زیادہ تھے۔ جب اشتراکی فلسفہ عام ہوا اور ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا تو کرشن چندر اشتراکی ہو گئے اور اشتراکیت کا پرچار کرنے لگے۔ جب سلمیٰ صدیقی کی والدہ اس بات پر اصرار کرنے لگیں کہ کرشن چندر مسلمان ہوں گے تب یہ شادی ہوگی تو کرشن چندر مسلمان ہو گئے نیز کلمہ پڑھا اور اسلامی قوانین کے مطابق شادی

کی رسم ادا کی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلامی نام کا معاملہ آیا تو مولانا (نکاح خواں) نے ان کے لیے اللہ رکھا نام تجویز کیا لیکن کرشن چندر نے اس نام کو رد کرتے ہوئے خود اپنا نام وقار ملک رکھا۔ اس واقعے کو نند کشور وکرم یوں بیان کرتے ہیں :

''نکاح کے بعد چونکہ نام بدلنا اشد ضروری تھا لہٰذا ان کا نام اللہ رکھا تجویز کیا گیا مگر کرشن چندر کو یہ گھسا پٹا پرانا نام پسند نہ آیا۔ لہٰذا انہوں نے مولوی صاحب کو نکاح نامے میں اپنا نام وقار ملک لکھوایا کیونکہ پونچھ میں ان کے دو بچپن کے ساتھی تھے وقار اور ملک۔ ان کے ساتھ ان کا بڑا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اور ان سے ان کی گہری دوستی تھی۔''۱۳

کرشن چندر بے شک شادی کے وقت مسلمان ہو گئے لیکن بنیادی طور پر وہ نہ ہی ہندو اور نہ ہی مسلمان تھے۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو ایک انسان تسلیم کرتے تھے کیونکہ مذہب سے بڑھ کر انسانیت ان کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتی تھی۔ عید وشب قدر کے روز بھی وہ بڑے خلوص سے سلمیٰ کے ساتھ عید یا شب قدر مناتے تھے اور دیوالی یا ہولی بھی اپنے خاندان کے ساتھ خوشی خوشی مناتے تھے۔

کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی کی ازدواجی زندگی ۱۷ سالہ عرصے پر محیط ہے لیکن ان سترہ سالوں میں کرشن چندر نے سلمیٰ کو ہر ممکن آرام وآسائش فراہم کرنے کی کوشش کی۔ کرشن چندر روس اور اٹلی سے لے کر کشمیر تک مختلف ممالک میں سلمیٰ کو ہمراہ لے کر سیر و سیاحت سے ان سترہ سالوں میں لطف اندوز ہوتے رہے۔ دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے ۱۹۷۷ء میں کرشن چندر کا انتقال ہو گیا نیز سلمیٰ صدیقی کرشن چندر کے بغیر ان سترہ سالہ خوبصورت یادوں کے سہارے مزید ۴۰ سال بسر کرنے کے بعد ماضی قریب میں ہی ۱۳ فروری ۲۰۱۷ء کو بمقام ممبئی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

کرشن چندر کو دل کا عارضہ تھا جس نے آخر کار انہیں اس دنیاء سے الوداع ہونے کا بہانہ فراہم کیا۔ ان کو دل کا پہلا دورہ ۲۳ نومبر ۱۹۶۷ء کو پڑا لیکن پھر صحت کافی بہتر ہوگئی۔ اس کے بعد انہیں دل کا دوسرا دورہ ۱۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو پڑا لیکن اس کے بعد مزید سات سال صحت کافی بہتر رہی اور اس مرض نے زیادہ پریشان نہیں کیا۔ دل کا تیسرا دورہ انہیں ۲۷ جولائی ۱۹۷۶ء کو پڑا جس نے ان کی صحت کو کافی متاثر کیا۔ چوتھا دورہ انہیں ۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو پڑا جس کی وجہ سے ان کی صحت کافی حد تک نازک اور تشویش ناک صورت حال اختیار کرگئی۔ آخر کار چوتھے دل کے دورے کی تاب نہ لاکر کرشن چندر ۸ / مارچ ۱۹۷۷ء کو صبح کے وقت ممبئی کے ایک اسپتال میں اس جہانِ فانی سے جہانِ باقی کی طرف کوچ کر گئے۔ اس طرح اردو دنیا نے ایک عظیم فن کار کھودیا اور ایشیاء کے عظیم فنکار یا افسانہ نگار نے اردو دنیا کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ یہ تو اس دنیا کا دستور ہے اور خالق کا فیصلہ بھی ہے کہ ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن کرشن چندر نے اپنی موت سے چند گھنٹے پہلے بطور وصیت سلمیٰ صدیقی سے جو باتیں کی تھیں وہ یقیناً بے حد متاثر کن اور قابل غور ہیں۔ بے شک ایسی باتیں ایک سنجیدہ، باشعور، دوراندیش اور محتاط وحساس شخص ہی کرسکتا ہے۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے جگدیش چندر ودھاون سلمیٰ صدیقی کی تحریر سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''سلمیٰ رونے لگیں تو چونک کر آنکھیں کھول دیں .... بڑی کوشش سے بولے ''بس اتنا ہی ساتھ تھا۔ مجھے معاف کردو۔ کوئی سکھ تمہیں نہیں دے سکا۔ ویسے میں نے بڑی بھرپور زندگی بیتائی .... ہاں دیکھو، میرے بعد یہاں سے جلدی گھر چلی جانا۔ یہاں سبھی دل کے مریض ہیں۔ دل کے مریض پر اس طرح کی بات کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ تم یہاں رہوگی تو دوسرے لوگ بھی

صبر کھو بیٹھیں گے۔ اور سلمیٰ سنو، میری تم سے درخواست ہے کہ دُکھ کو ہمت اور تحمّل سے برداشت کرنا" .... پھر رُک کر بولے
"بمبئی میں مکان بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اگر ہو سکے تو گھر مت چھوڑنا۔ علی گڑھ میں تو اب رشید صاحب بھی نہیں رہے۔ اگر حالات پر قابو نہ پایا جا سکے تو پاکستان چلی جانا۔ وہاں میرے بہت سے دوست ہیں۔ وہ لوگ سچ مُچ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ تم وہاں اکیلی نہ رہو گی۔ اور دیکھو، میرا پیس میکر بالکل نیا ہے۔ اس کو نکلوا کر کسی حاجت مند کو لگوا دینا۔ یہیں اس اسپتال کو دے دینا" [۱۴]

بے شک اقتباس طویل ہو گیا ہے لیکن اس اقتباس میں پیش کردہ وہ باتیں ہیں جو کرشن چندر نے موت سے کچھ دیر پہلے کی تھیں۔ اس اقتباس سے جہاں ہمیں کرشن چندر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور مختلف خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے وہیں پر ان باتوں سے ہمیں بہت سے اہم سبق بھی ملتے ہیں۔

کرشن چندر اردو ادب خصوصاً اردو فکشن کا ایک ایسا نام ہے جس کے بغیر تاریخ اردو ادب نامکمل ہے۔ کرشن چندر نے اردو ادب کو بہت سی تخلیقات کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے تجربات بھی دیے۔ انہوں نے ناول، افسانے، ڈرامے، انشائیے، رپورتاژ اور سفرنامہ وغیرہ کے ذریعے اردو ادب کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ایک نئی جہت پر لا کھڑا کیا۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی میں ان کی کتابوں پر "ایشاء کا عظیم افسانہ نگار کرشن چندر" لکھا جاتا تھا اور انہیں ایشاء کا عظیم افسانہ نگار کہا جاتا تھا۔ اس لیے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ان عوامل کو سامنے لایا جائے جنہوں نے ایسی عظیم شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں کرشن چندر کی تعلیم و تربیت، ذہنی و فنی سفر اور ارضیت سے وابستگی کے حوالے

سے تفصیلاً گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ کون سے سیاسی، سماجی و معاشرتی یا گھریلو حالات تھے جنہوں نے انہیں لکھنے پر مجبور کیا یا متوجہ کیا اور وہ کون سا تعلیمی وتربیتی نیز سماجی وادبی پس منظر تھا جس میں کرشن چندر کی شخصیت اور فنی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

تعلیم وتربیت

کرشن چندر کی ولادت پونچھ میں ہوئی۔ حالانکہ اس وقت ان کے والد بھرت پور (راجستھان) میں بحیثیت ڈاکٹر تعینات تھے لیکن کرشن چندر کی والدہ کے قریب کے رشتہ دار پونچھ میں رہتے تھے اور ان کی والدہ ان دنوں اپنے رشتہ داروں کے ہاں پونچھ میں قیام پذیر تھیں۔ لیکن کرشن چندر کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز مہنڈر (پونچھ) سے ہوا۔ ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ اس وقت مہنڈر میں ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے کیونکہ ان کے والد کا بھرت پور سے مہنڈر میں تبادلہ ہوا تھا۔ لہٰذا ان کی تعلیم کا آغاز مہنڈر کے ایک پرائمری اسکول سے ہوا۔ یہ پرائمری اسکول آج بھی گورنمنٹ ڈگری کالج مہنڈر کے بالکل قریب واقع ہے۔ اب اس کے بعد کرشن چندر نے چھٹی اور ساتویں دو کلاسیں کہاں سے پاس کی اس حوالے سے ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملتا۔ کیونکہ ان دو کلاسوں کے حوالے سے نہ ہی کرشن چندر کی تقریر وتحریر سے کوئی اشارہ ملتا ہے اور نہ ہی کرشن چندر شناسوں نے اس حوالے سے کہیں ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ہائی اسکول کا امتحان وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ سے پاس کیا جو اس وقت گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول بوائز پونچھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بقول جگدیش چندر ودھاون:

> ''پانچ سال کی عمر میں وہ مہنڈر کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ آٹھویں جماعت سے انہوں نے وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ میں تعلیم حاصل کی۔''[۱۵]

کرشن چندر کی تعلیم کے آغاز کے حوالے سے جیلانی بانو اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

''کرشن چندر نے پانچ برس کی عمر میں مہنڈر (کشمیر) کے ایک پرائمری اسکول سے تعلیم کی ابتدا کی۔ آٹھویں سے دسویں جماعت تک وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ میں پڑھا۔''[۱۶]

کرشن چندر کی تعلیم کے حوالے سے اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انہیں شروع شروع میں اردو، فارسی اور سنسکرت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی جس کا ذکر انہوں نے خود اپنے سوانحی ناول ''مٹی کے صنم'' میں بھی کیا ہے بقول کرشن چندر :

''پانچویں جماعت تک بڑی مشکل سے اردو پڑھی مگر روز مار کھائی۔ آخر اردو چھوڑ کر چھٹی کلاس میں سنسکرت لی وہ اردو سے بھی مشکل نکلی اور پنڈت جی نے مار مار کر میری کھال میں بھوسہ بھر دیا مگر سنسکرت کسی طرح نہیں بھر سکے۔ پنڈت جی کی مار سے عاجز آکر میں نے سنسکرت چھوڑ کر آٹھویں کلاس میں پرشین اختیار کی۔ یہاں ماسٹر بلاقی رام نے پیٹنا شروع کیا کیونکہ ایک تو مجھے پرشین نہیں آتی تھی دوسرے میں اخبار پڑھتا تھا۔''[۱۷]

پونچھ سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد کرشن چندر نے فارمن کرسچن کالج لاہور سے ایف۔ایس۔سی کا امتحان پاس کیا جسے آج کل انٹرمیڈیٹ یا 10+2 کہا جاتا ہے۔ان کے والد ایک ڈاکٹر تھے اور وہ کرشن چندر کو بھی ایک ڈاکٹر ہی بنانا چاہتے تھے جبکہ ان کی والدہ انہیں ایک وکیل بنانا چاہتی تھی لیکن کرشن چندر کو ان دونوں پیشوؤں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے سیاسیات، معاشیات، تاریخ، اور ادب مضامین کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں انگریزی میں ایم۔اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔

کرشن چندر کی والدہ کا اصرار تھا کہ وہ ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کریں اور وکالت کا پیشہ اختیار کریں کیونکہ یہ بڑا باعزت وباوقار پیشہ ہے۔ کرشن چندر نے اپنی والدہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ۱۹۳۷ء میں ایل۔ایل۔بی کا امتحان بھی پاس کرلیا لیکن اس پیشے کو کبھی عملی طور پر نہیں اپنایا۔ اس طرح کرشن چندر کی تعلیم کا سلسلہ مکمل ہوگیا۔ حالانکہ کرشن چندر کی خواہش تھی کہ وہ علامہ اقبال پر پی۔ایچ۔ڈی بھی کریں لیکن ان کی اس خواہش کو خود علامہ اقبال نے ہی مکمل نہیں ہونے دیا کیونکہ جب کرشن چندر نے اس معاملے میں علامہ اقبال سے ملاقات کی اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو علامہ اقبال نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ہم زندہ لوگوں پر پی۔ایچ۔ڈی کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بقول جگدیش چندر ودھاون بحوالہ کنہیالال کپور :

> ''یہ بھی ہے لیکن سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ اقبال ابھی تک زندہ ہیں اور ہم کسی زندہ شخصیت پر کسی شخص کو تھیسیس لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔'' ۱۸

مذکورہ سطور میں پیش کیے جانے والے الفاظ خود علامہ اقبال کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں جنہیں کنہیالال کپور نے نقل کیا ہے۔ اس طرح کرشن چندر کا پی۔ایچ۔ڈی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور ایل۔ایل۔بی پر ہی ان کا تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔

تربیت کے اعتبار سے یہ بات عام ہے کہ بچے کی تربیت میں اس کی والدہ کا اہم کردار ہوتا ہے لیکن یہاں ہمیں سب کچھ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ عادات واطوار، سوچ وفکر، خیالات، احساسات وجذبات، خواہشات الغرض ہر اعتبار سے ہمیں کرشن چندر ہو بہو اپنے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ کی فوٹو کاپی نظر آتے ہیں۔ یہاں ہم ان کے والدین کے خیالات ونظریات ان ہی کی زبانی محسوس کرسکتے ہیں۔ اپنے والدین کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کرشن چندر اپنے سوانحی ناول میں لکھتے ہیں :

''میری ماں سناتن دھرم کی پجاری تھیں۔ باپ آریہ سماجی تھے۔
دونوں میں اکثر نوک جھونک رہتی۔ کبھی کبھی اس بحث میں وہ مجھے
بھی شامل کر لیتے۔ جب پتا جی مجھ سے بہت لاڈ پیار کرتے تو
آخر میں ضرور پوچھتے اور میری ماں کو چڑا چڑا کر پوچھتے۔ میرا
بیٹا آریہ سماجی ہے نا؟ اور میں ان کی گود میں مچل کر کہتا ہاں میں
آریہ سماجی ہوں۔''۱۹

دوسری جگہ بطور خاص اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے کرشن چندر انہیں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ کرشن چندر لکھتے ہیں :

''وہ ایک کٹر ہندو عورت ہے جو مندر جاتی ہے گوردوارے جاتی
ہے۔ جپ جی کا پاٹھ کرتی ہے۔ مسلم مزاروں پر نذر نیاز دیتی ہے
اور یہ اس کے خون میں ہے۔''۲۰

مذکورہ اقتباسات سے ان کے والدین کے خیالات ونظریات اور مزاج وعادات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک اور اقتباس پیش نظر ہے جس سے ان کے والدین کی تصویریں نمایاں ہوتی ہیں۔ ان کے والد چھوت چھات یا ذات پات پر بالکل یقین نہیں رکھتے لیکن ان کی والدہ ان سب چیزوں کو گلے لگائے ہوئے ہے۔ تاراں ایک چمار کی بچی ہے جس سے کرشن چندر بچپن میں کھیلتے ہیں۔ کرشن چندر کے والد تاراں (ایک چمار کی بچی) سے بھی اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں لیکن ان کی والدہ اس بچی سے اس وجہ سے نفرت کرتی ہے کہ وہ ایک چمار کی بیٹی ہے اور کم ذات ہے۔ بقول کرشن چندر یہ اقتباس بھی پیش خدمت ہے :

''اور میری ماں نے تاراں کو پکڑ لیا تھا۔ اور اسے زور زور سے
طمانچے اور مکے مار مار کر کہہ رہی تھی۔ کم بخت، کمینی، اچھوت، کم

ذات لڑکی آج پورن ماشی کے شبھ دن پر میرے بچے کے ساتھ کھیلتی
ہے۔ جبھی تو وہ اچھا نہیں ہوتا۔ دیکھ تو سہی آج میں تیری ہڈیاں توڑ
کر رہوں گی۔ میرے پتا جی نے روتی ہوئی تاراں کو اپنی گود میں
اٹھا لیا اور اسے باغیچے میں لے گئے۔ اور اس کی جھولی سرخ سرخ
سیبوں سے بھر دی۔'' ۲۱

مذکورہ اقتباسات سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ کرشن چندر کی والدہ کٹر ہندو عورت تھیں اور چھوت چھات پر مکمل یقین رکھتی تھیں۔ اس کے برعکس ان کے والد کی نظر میں چمار کی بیٹی بھی اپنے بچوں کی طرح گود میں اٹھانے کے قابل تھی۔ مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کرشن چندر کی تربیت میں ان کے والد کا بہت زیادہ رول رہا ہے۔ کرشن چندر کو ان کے والد نے بچپن سے ہی یہ سکھایا تھا کہ وہ کبھی ذات پات، چھوت چھات یا مذہب اور رنگ ونسل وغیرہ جیسی چیزوں پر یقین نہ کریں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر نے ایک اچھے انسان کی مثال پیش کی ہے۔ کرشن چندر نے ذات پات، مذہب وملت، رنگ ونسل اور علاقائیت وغیرہ سب چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انسان، انسانیت اور انسانیت پرستی پر یقین کیا ہے۔ اس طرح کرشن چندر کی تربیت میں ان کی والدہ کا رول قدرے کم ہے اور اساتذہ کا ان سے بھی کم۔ بس ان کی تربیت میں سب سے زیادہ حصہ ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ کا ہی ہے۔ جس طرح ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ ذات پات، چھوت چھات اور رنگ ونسل کی تفریق کو نیز مذہبی شدت پسندی کو نظر انداز کرتے ہوئے انسان وانسانیت پر یقین رکھتے تھے اسی طرح کرشن چندر نے بھی مذکورہ تمامی سماجی خامیوں سے بالاتر ہو کر مثالی زندگی گزاری ہے اور ذات پات، مذہب وملت اور رنگ ونسل سے اوپر اٹھ کر اپنی تخلیقات کے ذریعے انسان وانسانیت کی حمایت کی ہے اور انسانی عظمت کو ابھارا ہے۔

ذہنی وفنّی سفر

کرشن چندر پاکیزہ، انسانیت پرست، اور آزاد ذہن لے کر اس دنیا میں آئے تھے۔ یہ ذہن انہیں وراثت میں ملا تھا یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد سے تحفے کے طور پر لیا تھا جس تحفے کو انہوں نے زندگی بھر بڑے سلیقے سے استعمال کیا۔ ان کے والد پیشے کے اعتبار سے تو ایک ڈاکٹر تھے لیکن نظریاتی اعتبار سے وہ آریہ سماجی تھے اس لیے ذات یا دھرم کے نام پر کوئی بھی تفریق انہیں قطعی پسند نہیں تھی۔ وہ خود بھی انسانیت پرست تھے اور اپنے بیٹے یعنی کرشن چندر کو بھی ایک مثالی انسان بنانا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس بقول کرشن چندر پیش کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ کرشن چندر لکھتے ہیں :

> ''مہنڈر ہی میں میں نے پہلی بار الف لیلیٰ پڑھی، اور منشی پریم چند کو پڑھا۔ مہنڈر ہی میں میں نے پہلی بار مہاتما گاندھی کا نام سُنا اور ان کی چھوت چھات اور ذات پات کو مٹا ڈالنے والی تحریک کے سلسلے میں میرے پِتا جی نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کبھی اپنی ذات پر فخر نہیں کروں گا، اور کبھی اپنے نام کے آگے اپنی ذات نہیں لکھوں گا۔'' ۲۲

اس اقتباس سے ایک تو ہمیں کرشن چندر کے ذہنی سفر کا سراغ ملتا ہے کہ جب کرشن چندر مہنڈر میں تھے یعنی سات آٹھ یا دَس سال کے تھے اس وقت ان کے والد ان کے مثبت ذہنی فروغ کے لیے کس قدر کوشاں تھے۔ شاید کرشن چندر کو اپنے والد سے کیا ہوا وعدہ زندگی بھر ذہن نشین رہا اور اس پر عمل پیرا بھی رہے۔ مذکورہ اقتباس سے دوسری بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ کرشن چندر کو بچپن میں ہی ادب سے کتنی دلچسپی تھی اور وہ اس وقت یعنی بچپن میں ہی الف لیلیٰ اور پریم چند کو پڑھتے تھے۔ اس طرح کرشن چندر کا ذہنی سفر تو اپنے والد کی نگرانی میں یا زیرِ سایہ مہنڈر سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اسی کے

ساتھ ساتھ ادب سے دلچسپی خاص کر کے فکشن سے دلچسپی بھی انہیں اسی وقت سے ہے۔ اس طرح کرشن چندر کے ذہنی وفنی سفر اور ادب سے دلچسپی کے حوالے سے سرزمین مہنڈر کا بھی خاص حصہ ہے۔ کرشن چندر کو سرزمین مہنڈر پر اور مہنڈر واہل مہنڈر کو کرشن چندر پر ناز ہے۔

مہنڈر کے بعد ان کا ذہنی وفنی سفر تب ایک نئی کروٹ لیتا ہے جب کرشن چندر تعلیم کے سلسلے میں پونچھ چلے جاتے ہیں۔ اس وقت ملک کے سیاسی حالات کافی حد تک ابتری اور افراتفری کے شکار تھے۔ ہندوستانی قوم انگریز قوم کی غلام تھی اور اس غلامی کو صرف بڑے اور پڑھے لکھے لوگ ہی محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ طلبا بھی اس فضا کو بخوبی محسوس کرتے تھے اور کیا ہو رہا ہے یا کیا ہونے والا ہے اس سے فکرمند تھے۔ لیکن حکومت کا دباؤ اتنا تھا کہ طلباء کو اخبار تک پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس صورت حال کو کرشن چندر کا یہ اقتباس بخوبی واضح کر دیتا ہے بقول کرشن چندر :

> ''یوں غور سے دیکھا جائے تو مجھے لیکھک بنانے کی ساری ذمہ داری ہمارے ہوم منسٹر شری گلزاری لال نندہ کے خاندان پر عائد ہوتی ہے۔ جن دنوں میرے والد پونچھ میں تھے ان ہی دنوں شری گلزاری لال نندہ کے والد بلاقی رام نندہ بھی پونچھ میں تھے۔ وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں پڑھاتے تھے...... میں نے سنسکرت چھوڑ کر آٹھویں کلاس میں پرشین اختیار کی، یہاں ماسٹر بلاقی رام نے پیٹنا شروع کیا۔ کیونکہ ایک تو مجھے پرشین نہیں آتی تھی دوسرے میں اخبار پڑھتا تھا۔'' ۲۳

یہاں سے ان کے ذہنی وفنی سفر دونوں ایک نیا موڑ لیتے ہیں۔ ایک تو جتنا انہیں اخبار و رسائل پڑھنے سے روکا جاتا ہے یہ اتنے ہی شوق سے چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں اور

حالات حاضرہ سے باخبر رہتے ہیں یا رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ماسٹر بلاقی رام کی پٹائی نے انہیں لکھنے پر مجبور کیا اور انہوں نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون ''پروفیسر بلیکی'' لکھا جس میں ماسٹر بلاقی رام کا مذاق اُڑایا گیا۔ یہ مضمون انہوں نے دیوان سنگھ مفتوںؔ کے رسالے ''ریاست'' (دلی) میں بھیج دیا اور شائع بھی ہوا جو عوام میں بہت مشہور ہوا جس کی وجہ سے انہیں اپنے والد سے ڈانٹ بھی پڑی۔ اسی وجہ سے اس کے بعد ان کا لکھنے کا سلسلہ کافی دنوں تک رُکا رہا۔ لہٰذا ان کے فن کا آغاز اسی مضمون ''پروفیسر بلیکی'' سے ہوتا ہے۔ اسی اسکول میں اُردو کے استاد ماسٹر دینا ناتھ بھی تھے۔ یہ پونچھ بھر میں واحد شاعر تھے اور شوقؔ تخلص رکھتے تھے۔ ان دنوں کرشن چندر نے اپنے احساسات و جذبات یا خیالات کا اظہار شاعری میں بھی کیا اور اصلاح کی غرض سے ماسٹر دینا ناتھ کی خدمت میں اپنا کلام پیش کیا۔ اس کلام کی نوعیت کیا تھی یا اس کلام کا معیار کیا تھا یہ الگ بات ہے۔ لیکن ماسٹر جی نے اصلاح کی جگہ انہیں دو تھپّڑ مارے اور ساری کلاس کے سامنے ان کی شاعری کا مذاق اُڑایا۔ کرشن چندر نے اس واقعے کا ذکر بھی اپنی تخلیقات میں کیا ہے بقول کرشن چندر :

> ''کیونکہ سارے شہر میں وہ اکیلے شاعر تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے اُن کا کوئی رقیب پیدا ہو۔ اس لیے انہوں نے میری اولین شاعرانہ کاوش کا مذاق اُڑا کے میری شاعرانہ صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ورنہ میرا آج بھی یہ خیال ہے کہ وہ چیز بہت عمدہ تھی جو کچھ بھی تھی۔ نظم، غزل یا گیت...... میرا بہترین شاہکار تھی۔'' [۲۴]

بے شک کرشن چندر کے اندر ایک خاص شاعرانہ ذوق بھی تھا اور انہیں شعر و شاعری میں خاص دلچسپی بھی تھی لیکن ان خصوصیات کو سراہنے کی جگہ ان کے شعری احساسات و جذبات کو دبوچ دیا گیا جس کی وجہ سے کرشن چندر شاعر نہیں بن سکے ورنہ آج اردو زبان و

ادب کی تاریخ میں شاید کرشن چندر کا نام بحیثیت شاعر بھی موجود ہوتا۔اس کے باوجود بھی اکثر ناقدین وقارئین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کرشن چندر نثر میں بھی شاعری کرتے ہیں اور ان کی شاعرانہ زبان کا کوئی ثانی نہیں۔ بہر حال یہ تھیں کرشن چندر کی اولین شعری ونثری کاوشیں جو ذہنی ارتقاء کے مراحل سے گزر کر فنی سفر کا آغاز کر رہی تھیں لیکن ان کی اولین کاوشوں کے نظر انداز کرنے پر انہیں حوصلہ افزائی کی جگہ حوصلہ شکنی سے دوچار ہونا پڑا اور ان کا یہ تخلیقی سلسلہ کچھ عرصے کے لیے رُک گیا۔اس طرح پونچھ کے دنوں سے ہی ان کے فنی سفر کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ارتقاء کے لیے یہاں ماحول سازگار نہیں تھا۔اب کرشن چندر کو کسی ایسے ادبی وفنی سازگار ماحول کی ضرورت تھی جہاں ان کے فنی سفر کو آگے بڑھنے میں مدد مل سکے۔ پونچھ کے بعد کرشن چندر تعلیم کے سلسلے میں لاہور چلے گئے اور لاہور میں جا کر انہیں وہ ادبی ماحول میسّر آیا جس کی انہیں تلاش تھی۔

کرشن چندر کے فنی سفر کا باقاعدہ آغاز ان کی ایک کہانی ''یرقان'' سے ہوتا ہے جو ''ادبی دنیا'' لاہور سے شائع ہوئی اور رسالے کے مدیر میاں صلاح الدین احمد نے اس کہانی کی اور اس کے فنکار کی بے حد تعریف بھی کی۔ ''یرقان'' ان کے پہلے افسانوی مجموعے (طلسم خیال، مکتبہ اُردو لاہور ۱۹۳۸ء) میں شامل ہے۔ کرشن چندر نے مذکورہ کہانی قیامِ مہنڈر کے دنوں میں لکھی تھی لیکن یہ کہانی مہنڈر کے طالب علمی کے زمانے کی نہیں ہے بلکہ دوبارہ کرشن چندر نے مہنڈر میں قیام کیا ہے اور ان دنوں یہ کہانی لکھی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ کرشن چندر نے خود تو دوبارہ مہنڈر میں قیام کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے سوانحی کوائف سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے دوبارہ مہنڈر میں زیادہ مدت کے لیے قیام کیا ہو۔ یا تو مہنڈر میں ان کا دوبارہ قیام چند روزہ ہے یا پھر انہوں نے مہنڈر کی عقیدت میں ڈوب کر ایسا کہہ دیا ہے۔ کرشن چندر کے دوبارہ مہنڈر میں قیام کرنے اور پہلی چار کہانیاں مہنڈر میں لکھنے کے حوالے سے محترم ایوب شبنم سرنکوٹی کا دعویٰ

کافی حد تک قرین قیاس ہے۔ ایوب شبنم عمر میں کرشن چندر سے کافی چھوٹے ہیں اور ابھی تک باحیات ہیں۔ ان کے کرشن چندر کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ کرشن چندر کا ان کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعے لگا تار رابطہ بھی تھا۔ ان کے مراسم کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایوب شبنم اور ان کی اہلیہ حج کے لیے گئے تو انہیں بمبئی ایئرپورٹ کے راستے جانا پڑا۔ بمبئی میں کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی انہیں اپنے گھر لے گئے اور ان کی خصوصی دعوت کی نیز ایئرپورٹ تک ساتھ آ کر انہیں الوداع کیا۔ ایوب شبنم سرنکوٹی کا یہ دعویٰ ہے کہ کرشن چندر تعلیم کے سلسلے میں لاہور میں ہی قیام پذیر تھے کہ اچانک یہ کافی بیمار ہو گئے۔ اس وقت ان کے والد مہنڈر میں ہی تعینات تھے۔ ان کے والد نے انہیں لاہور سے مہنڈر لایا اور یہیں پر ان کا علاج کیا۔ لہٰذا کرشن چندر نے اسی بیماری کے دوران نیز اس مختصر قیام مہنڈر کے دوران ہی اپنی پہلی چار کہانیاں لکھیں۔ کرشن چندر کے ایوب شبنم کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے اس لیے عین ممکن ہے کہ کرشن چندر نے اس حوالے سے ایوب شبنم کے ساتھ ذکر کیا ہو۔ اس طرح ایوب شبنم صاحب کا یہ دعویٰ کافی حد تک صداقت پر مبنی محسوس ہوتا ہے لیکن اس بیماری کے دوران مہنڈر میں قیام کرنے کے حوالے سے کرشن چندر کی تحریروں سے کوئی سراغ نہیں ملتا البتہ پہلی چار کہانیاں مہنڈر میں لکھی گئیں، اس بات کا ثبوت ان کی تحریروں سے ضرور ملتا ہے۔ اس حوالے سے کرشن چندر خود لکھتے ہیں :

> ''مہنڈر میں ہم سات سال رہے۔ چار سال بچپن میں اور تین سال جوانی میں...... مہنڈر کی ندیوں میں میں نے پہلی بار اچھی طرح سے تیرنا سیکھا۔ پہلا پریم مہنڈر میں کیا۔ پہلی چار کہانیاں مہنڈر میں لکھیں۔ جہلم میں ناؤ پر، آنگی، مصور کی محبت اور یرقان۔ میرے پہلے ناول شکست کا پس منظر مہنڈر رہے۔ میری زندگی کی بہت سی شروعات مہنڈر سے ہوتی ہے۔'' ۲۵

اس اقتباس میں کہی گئی باتیں کس حد تک صداقت پر مبنی ہیں، اس حوالے سے وثوق

کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اس اقتباس سے کرشن چندر کی مہنڈر کے تئیں عقیدت ومحبت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے نیز ''یرقان'' کرشن چندر کی پہلی کہانی ہے اور اس کہانی سے ان کے فنی وادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے، اس بات کی بھی کرشن چندر کی زبانی تصدیق ہوتی ہے۔ کرشن چندر کی اولین تخلیق پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جیلانی بانو یوں رقم طراز ہیں :

''ان کی پہلی کہانی ''یرقان'' ہے جو رسالہ ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوئی۔ لیکن ان کی ادبی زندگی ان کے افسانے ''جہلم میں ناؤ پر'' سے شروع ہوتی ہے جس نے اپنی اشاعت کے ساتھ ہی ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔'' ۲۶

۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۰ء تک کرشن چندر کا قیام اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لاہور میں رہا۔ اس قیام کے دوران ان کی زندگی میں بڑا انقلاب آیا۔ یہ انقلاب ذہنی وفنّی دونوں نقطۂ نظر سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں آ کر انہوں نے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ جب یہ فارمن کرسچن کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے تو یہاں یہ کالج میگزین کے شعبۂ اُردو کے ایڈیٹر بھی رہے اور اس میگزین میں ان کے انگریزی مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے دوران انہوں نے سنت سنگھ سیکھو کے اشتراک سے ایک رسالہ ''دی ناردرن ریویو'' بھی جاری کیا۔ فریدہ بیدی نامی عورت کے ساتھ مِل کر انہوں نے انگریزی ماہنامہ ''دی ماڈرن گرل'' کی بھی ادارت کی۔ ان دنوں ان کے مضامین انگریزی روزنامہ ''دی ٹریبون'' میں بھی برابر شائع ہوتے رہے۔ الغرض اب نہ کوئی پٹائی کرنے والا تھا اور نہ حوصلہ شکنی والا۔ لہٰذا اب انہوں نے لگاتار لکھنا بھی شروع کر دیا اور ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی بھی ہونے لگی۔ اس طرح حوصلے بلند ہونے لگے اور ذہن وفن دونوں کو فروغ کا موقع میسّر ہوا۔ قیامِ لاہور کے دوران ہی ان کا اوّلین افسانوی

مجموعہ ''طلسم خیال'' ۱۹۳۸ء میں مکتبۂ اُردو لاہور سے شائع ہوا جس کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ قیام لاہور کے دوران ان کے کُل تین افسانوی مجموعے طلسم خیال، نظارے، اور ہوائی قلعے، شائع ہوئے۔ موخرالذکر مزاحیہ افسانوں پر مشتمل ہے جو فنی اعتبار سے افسانے کم انشائیے زیادہ ہیں۔ لاہور میں کرشن چندر کی ملاقات کنہیالال کپور اور اوپندر ناتھ اشک سے ہوئی اور جلد ہی ان کے درمیان دوستانہ مراسم قائم ہو گئے جو عمر بھر باقی رہے۔ ان دنوں کرشن چندر اپنے افسانے کنہیالال کپور سے پڑھواتے اور ان سے رائے بھی لیتے تھے۔ مختصر یہ کہ لاہور میں انہیں مکمل طور پر ادبی ماحول بھی میسّر آیا اور بہت سی ادبی شخصیات بھی انہیں میسّر آئیں جنہوں نے ان کی تخلیقات کو سراہا، ان کے حوصلے بلند کیے اور ان کی بہترین مشاورت بھی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کرشن چندر کا فنی سفر تیزی کے ساتھ ارتقائی منازل طے کرنے لگا۔

جب کرشن چندر لاہور میں ایل۔ ایل۔ بی سے فارغ ہوئے تو ترقی پسند تحریک وجود میں آ چکی تھی لیکن کرشن چندر نے تو ترقی پسندانہ خیالات اپنے والد سے بہت پہلے ہی حاصل کر رکھے تھے۔ اب ممکن ہی نہیں تھا کہ ایک شخص ایک ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے خیالات ونظریات کا حامی بھی ہو اور ترقی پسند تحریک میں شامل نہ ہو۔ لہٰذا انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی کلکتہ کانفرنس ۱۹۳۸ء میں باقاعدہ شرکت کی۔ اس شرکت پر ترقی پسند تحریک کے ادیبوں نے بڑی خوش اسلوبی اور خلوص دل سے ان کا استقبال کیا اور انہیں انجمن کی پنجاب شاخ کا سکریٹری بھی بنایا گیا۔ لاہور میں جب کرشن چندر انٹرمیڈیٹ میں تھے تو کالج سے بھاگ کر بھگت سنگھ کی انقلابی پارٹی میں شامل ہو گئے جس کی پاداش میں انہیں دو مہینوں کی جیل بھی کاٹنی پڑی۔ دو ماہ بعد ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملنے پر انہیں رِہا کر دیا گیا۔

کرشن چندر کا پہلا ناول ''شکست'' ۱۹۴۳ء میں جب منظر عام پر آیا تو چند

ناقدین نے اس پر نقطہ چینی بھی کی لیکن اکثر ادبی حلقوں نے اس کو سراہا اور ''شکست'' کو ایک ادبی شاہکار قرار دیا گیا۔اس کے بعد انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد ناول لکھے جن میں سے دو سوانحی ناول قرار دیے جاسکتے ہیں ۔اس کے علاوہ زندگی کے ہر شعبے کے مسائل ومعاملات کو انہوں نے اپنے ذہن میں محسوس کیا، اپنی سوچ وفکر کا موضوع بنایا اوران مصائب ومسائل کو ناول کا روپ دے دیا۔اسی طرح انہوں نے بہت سے افسانے بھی لکھے ہیں ۔ان کے افسانوں کی تعداد تقریباً پانچ سو سے زائد ہے۔ ان کے ناول وافسانے فنّی وموضوعاتی دونوں اعتبار سے مختلف موضوعات وتجربات پر مبنی ہیں۔ان کی تخلیقات میں ہمیں فنی وموضوعاتی دونوں اعتبار سے رنگا رنگی، ندرت اورتازگی دیکھنے کو ملتی ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ کرشن چندر ایک آزاد اور ترقی پسندانہ ذہن اپنے والد سے وراثت میں لے چکے تھے۔دوسری بات اُس زمانے میں مختلف سیاسی جماعتیں آزادی کے لیے سرگرم عمل تھیں اور ذہین لوگوں پر اثر انداز ہورہی تھیں جنہوں نے کرشن چندر کو بھی متاثر کیا۔ تیسری طرف جب ترقی پسند تحریک وجود میں آئی اوراپنے ساتھ باقاعدہ ایک ادبی منشور بھی لائی تو کرشن چندر کی تخلیقات میں رومانیت کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی بھی عروج پر نظر آنے لگی۔اس طرح کرشن چندر کے ذہنی اور فنّی دونوں سفر برابر ارتقائی منازل کو طے کرتے رہے ۔ان کے اس ذہنی وفنی سفر میں بے شک کچھ رکاوٹیں بھی آئیں لیکن ان رکاوٹوں نے ان کے جذبات اورفن کواور زیادہ پختہ کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کرشن چندر ایک عظیم فنکار بن کر منظر عام پر آئے اورانہیں ایشیا کا عظیم افسانہ نگار یا فنکار کہا جانے لگا۔

ارضیت سے وابستگی

کرشن چندر کا آبائی وطن تو وزیرآباد (مغربی پنجاب) تھا لیکن ان کی زندگی

کا مختصر ساحصّہ بھی وزیرآباد میں نہیں گزرا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایک شخص جس کا آبائی وطن وزیرآباد ہے، ولادت پونچھ کی ہے لیکن اس شخص کی پوری زندگی دوسرے مختلف مقامات پر گزرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی محبت اور ذہنی یا روحانی وابستگی وزیرآباد کی جگہ دوسری جگہوں سے زیادہ ہے جس کا اعتراف وہ اپنی اکثر تخلیقات میں بڑی محبت سے اور بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ جن مقامات سے انہیں گہرا لگاؤ تھا اور ساری زندگی اس محبت ولگاؤ میں کمی کی جگہ اضافہ ہوتا گیا بلکہ اس محبت ولگاؤ میں شدت آتی گئی ان میں مہنڈر، پونچھ اور لاہور خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں مذکورہ مقامات سے کرشن چندر کی محبت اور وابستگی کے حوالے سے بھی تفصیلی تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے جس کی یہاں کوشش کی جارہی ہے۔

مہنڈر :

کرشن چندر کی ولادت پونچھ میں ہوئی لیکن اس وقت ان کے والد بھرت پور میں تعینات تھے۔ ان کی ولادت کے فوراً بعد ہی ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں مہنڈر چلے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۵ء کے آس پاس مہاراجہ پونچھ بہت سخت بیمار ہوئے۔ انہوں نے انگریزی سرکار سے اپنے علاج کے لیے کسی قابل ترین ڈاکٹر کی مانگ کی۔ انگریزی سرکار نے مہاراجہ کے علاج کے لیے کرشن چندر کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ کو پونچھ بھیجا۔ ان کے علاج سے مہاراجہ جلد صحت یاب ہوگئے۔ مہاراجہ نے اپنی صحت یابی کے بعد کرشن چندر کے والد کو مہنڈر میں تعینات کردیا۔ اس طرح ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ اپنے کنبے کے ساتھ مہنڈر میں ہی رہنے لگے۔ جگدیش چندر ودھاون نے اس حوالے سے ایک مختلف انکشاف کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ کی بھرت پور راجستھان میں کسی انگریز افسر سے کافی بحث ہوگئی تھی جس کی وجہ سے انگریز افسران پر خفا ہوگیا اور انہیں نوکری سے نکالنے کا حکم دے دیا۔ بعد میں درخواست کرنے پر نوکری

بحال کردی گئی لیکن سزا کے طور پر انہیں مہنڈر (پونچھ) میں تعینات کر دیا گیا جو کہ بھرت پور سے بہت زیادہ دور تھا۔ اس طرح ان کے والد اپنے کنبے کے ساتھ مہنڈر چلے گئے اور وہیں پر رہنے لگے۔ بہر حال وجہ جو بھی رہی ہو حاصل بحث یہ ہے کہ کرشن چندر کے والد بحیثیت ڈاکٹر مہنڈر میں تعینات ہو گئے اور اپنے کنبے کے ساتھ یہیں پر رہنے لگے۔

مہنڈر جو کہ اب ضلع پونچھ اور ریاست جموں وکشمیر کی ایک تحصیل ہے کرشن چندر کے وقت ریاست پونچھ کی ایک تحصیل تھی۔ مہنڈر کا علاقہ نہایت ہی خوبصورت اور دلفریب ہے۔ مہنڈر کا صدر مقام جہاں آج تمام سرکاری دفاتر ہیں اور جہاں کرشن چندر نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اور جہاں اسپتال میں ان کے والد ڈاکٹر بھی تھے، یہ جگہ پہاڑوں کے بیچ ایک مختصر سا میدانی علاقہ ہے۔ اس صدر مقام کو پہلے دھرم سال کہا جاتا تھا اور لفظ مہنڈر سے مراد تحصیل کا پورا علاقہ ہوتا تھا لیکن اب اس جگہ کا نام دھرم سال متروک ہو چکا ہے اور صدر مقام کو بھی مہنڈر ہی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مہنڈر بازار یا صدر مقام کے آر پار تینوں اطراف اونچے اور خوبصورت پہاڑ ہیں اور چوتھی جانب یعنی شمال مغرب کی سمت مہنڈر کا دریا بہتا ہوا پاکستانی مقبوضہ کشمیر کو نکل جاتا ہے۔ اس دریا کا پانی صاف وشفّاف ہوتا ہے اور اکثر لوگوں کی روز مرہ ضروریات کو سیراب کرتے ہوئے عوامی زندگیوں کو سہولیات فراہم کرتا ہے۔ مہنڈر کے صدر مقام سے تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر مغرب کی جانب سخی میدان نامی تاریخی مقام ہے۔ یہاں زمانہ قدیم کی بنی ہوئی بہت اونچی اونچی دیواریں ہیں جو بہت بڑے بڑے اور خوبصورت تراشے ہوئے پتھروں سے بنی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پانڈو نسل کے لوگوں نے یہ دیواریں اپنی والدہ کو آر پار کا نظارہ کروانے کے لیے بنائی تھیں۔ اسی سخی میدان جسے کرشن چندر نے اپنے سوانحی ناول میں سخی پیر کہا ہے سے تین کلومیٹر مغربی جانب رام کنڈ نامی مندر بھی ہے۔ رام کنڈ

مندر مہنڈر کے چھجلہ گاؤں میں واقع ہے جو مہنڈر کے صدر مقام سے آٹھ کلومیٹر کی دوری پر موجود ہے۔ یہ جگہ بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے نیز یہاں ملک کے مختلف حصوں سے ہندو لوگ ہزاروں کی تعداد میں سالہا سال درشن کو آتے ہیں۔ مذکورہ سبھی تاریخی مقامات کا ذکر کرشن چندر نے اپنے سوانحی ناولوں میں بھی کیا ہے اور ان مقامات کا تفصیلی ذکر ان کے ناول ''شکست'' میں بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مہنڈر میں بہت سے تاریخی مقامات ہیں۔ مہنڈر کے لوگ اپنی زمینوں سے فصل اگاتے ہیں۔ یہاں ہر آدمی کے گھر میں چھوٹا سا باغ ہوتا ہے نیز ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔ مختصر یہ کہ یہاں ایک صاف ستھرا، تروتازہ، کھلا اور آزاد و پاکیزہ ماحول میسّر ہے۔ اوپر جو نقشہ پیش کیا گیا ہے سرزمین مہنڈر کا یہی نقشہ تب بھی تھا اور آج بھی ہے۔ یہاں مہنڈر کا نقشہ کرشن چندر کی زبانی دکھانا بھی خاص اہمیت کا حامل ہوگا۔ مہنڈر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کرشن چندر لکھتے ہیں :

''مہنڈر میں بہت سی ندیاں اور نالے ہیں۔ دھوپ بھی بہت ہے بارش بھی اچھی ہوتی ہے۔ زیادہ تر زمین تین چار ہزار فٹ اونچی ہے۔ پہاڑ کہیں پر بھی چھ سات ہزار فٹ سے اونچے نہیں ہیں اور دور دور ہیں۔ گرمی بھی کم ہے، سردی بھی کم ہے اور برف بھی زیادہ نہیں گرتی، آب و ہوا معتدل ہے۔ آسمان چمکیلا، ہوا ٹھنڈی، پانی میٹھا، لمبی لمبی تکونی وادیوں میں نیلی ندیاں ہیں...... جب میں مہنڈر کو یاد کرتا ہوں تو میری نگاہوں میں پرانے بیتے ہوئے بھولے بسرے ہندوستان کی خوشحالی کی جھانکیاں گزرنے لگتی ہیں۔'' ۲۷

کرشن چندر اپنے سوانحی ناول ''مٹی کے صنم'' میں دوسری جگہ سرزمین مہنڈر کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں :

''اس زمانے میں مہنڈر کے کسان اپنا سوت خود کاتتے تھے۔ اپنی لوئیاں اور کمبل خود تیار کرتے تھے...... اپنی فصل خود اُگاتے تھے۔ اپنی سبزیاں خود تیار کرتے تھے۔ اس زمانے میں مہنڈر کے ہر کسان کے گھر کے چاروں طرف پھل دار پیڑوں کا ایک چھوٹا سا باغ ہوتا تھا جس میں سے وہ خوبانیاں، ناشپاتیاں اور سیب توڑ کر کھاتے تھے۔......اس زمانے کے مہنڈر میں ریڈیو نہیں تھا۔ ریل، موٹر، تانگہ تک نہیں تھا لیکن لوگ خوش تھے۔ جب لوگ کہتے ہیں کہ مشینوں کے بغیر خوشی ممکن نہیں ہے تو مجھے یقین نہیں آتا۔ میں نے مشینوں کے بغیر بھی خوشی دیکھی ہے۔'' ۲۸

مذکورہ اقتباسات سے جہاں ایک طرف مہنڈر کے جغرافیائی خدوخال، سماجی صورتحال اور یہاں کی روزمرہ زندگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے وہیں پر دوسری طرف کرشن چندر کی مہنڈر کے ساتھ محبت وعقیدت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مہنڈر کے اس آزاد اور فطری ماحول میں کرشن چندر نے پرورش بھی پائی اور ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ کرشن چندر مہنڈر سے سات سال وابستہ رہے۔ چار سال بچپن میں اور تین سال لڑکپن میں۔ لہٰذا انہوں نے بچپن میں بھی مہنڈر کی خوبصورتی سے لطف اٹھایا ہے اور لڑکپن میں بھی یہ مہنڈر کے قدرتی حسن سے لطف اندوز ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر مہنڈر کو زندگی بھر نہیں بھول پائے۔ ساری زندگی مہنڈر ان کی آنکھوں میں گھومتا رہا۔ کرشن چندر نے اپنی زندگی کا آغاز یا زندگی کے اکثر پہلوؤں کا آغاز مہنڈر سے ہی کیا تھا۔ اس لیے انہیں سرزمین مہنڈر سے بہت زیادہ محبت تھی جس کا اظہار انہوں نے اپنے سوانحی ناولوں میں بھی بڑے فخر سے کیا ہے۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کرشن چندر لکھتے ہیں :

''مہنڈر میں ہم سات سال رہے۔ چار سال بچپن میں اور تین سال

جوانی میں...... مہنڈر کو میں کبھی بھول نہیں سکا۔ اس کا سنہرا سایہ ساتھ ساتھ ہی چلتا رہا۔ مہنڈر میرے پہلے قدموں کا گاؤں ہے ...... مہنڈر کی ندیوں میں میں نے پہلی بار اچھی طرح سے تیرنا سیکھا۔ پہلا پریم مہنڈر میں کیا۔ پہلی چار کہانیاں مہنڈر میں لکھیں ...... میرے پہلے ناول شکست کا پس منظر مہنڈر رہے۔ میری زندگی کی بہت سی شروعات مہنڈر سے ہوتی ہے۔'' ۲۹

مذکورہ اقتباس سے ایک طرف تو کرشن چندر کے فنی آغاز کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف مہنڈر سے ان کی محبت ولگاؤ اور تاثرات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات کہنا بے سود نہ ہوگی کہ کرشن چندر مہنڈر کی رسم وروایات اور معاشرتی اقدار سے بہت زیادہ متاثر تھے اور مہنڈر کی رسم و روایات اور قدروں سے انہیں بہت زیادہ لگاؤ بھی تھا۔ سرزمین مہنڈر میں آج بھی ایسی مثبت تہذیبی خصوصیات اور ایسی قدریں زندہ ہیں جن پر کوئی بھی قوم اور کوئی بھی تہذیب بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ کرشن چندر ان تہذیبی خصوصیات اور ان قابلِ بقا اقدار سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اپنے سوانحی ناول ''مٹی کے صنم'' میں کرشن چندر مہنڈر کی ان خصوصیات اور قدروں کا ذکر اور مہنڈر و اہل مہنڈر کی عظمت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں :

''دودھ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ جو کسان دودھ کے پیسے لیتا تھا اسے برادری میں بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ یہ آج سے لگ بھگ پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ تو سوچیے آج سے ایک سو برس پہلے دو سو برس پہلے تین سو برس پہلے کیا حالت ہوگی'' ۳۰

کرشن چندر بے شک مہنڈر میں سات سال ہی رہے (بقول کرشن چندر) لیکن ایسا لگتا ہے کہ روحانی وذہنی اعتبار سے وہ ساری زندگی مہنڈر سے وابستہ رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی کافی کہانیوں میں مہنڈر کی شاندار عکاسی ملتی ہے۔ جب کرشن چندر اپنے احباب کے ہمراہ ۱۹۷۴ء میں ڈاکومینٹری فلم کی شوٹنگ کے لیے پونچھ گئے تو مہنڈر سے گزرتے ہوئے ان کی سبھی یادیں تازہ ہوگئیں اور محبتوں وحسرتوں کے ملے جُلے آنسوں بے ساختہ ان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ بمبر گلی نامی جگہ پر گاڑیوں کو روک کر کافی دیر مہنڈر کے علاقے کو دیکھتے رہے اور اپنے بچپن کے شب وروز کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ اس بات کا ذکر انہوں نے اپنے سفر نامے (ورق ورق کھوگئی زندگی میری) میں تفصیل سے کیا ہے۔ یہ سفر نامہ ان کے ۱۹۷۴ء کے سفر پونچھ پر ہی مبنی ہے۔ مختصر یہ کہ کرشن چندر کا بچپن اور لڑکپن مہنڈر کے فطری اور خوبصورت علاقے میں گزرا تھا جس کی وجہ سے انہیں اس سرزمین سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ مہنڈر سے ان کی محبت کا اندازہ ہمیں ان کی کئی تخلیقات سے بخوبی ہوتا ہے۔

پونچھ :

کرشن چندر کی ولادت بھی پونچھ میں ہوئی جس کی وجہ سے انہیں اپنی جائے ولادت سے خاص انس تھا۔ دوسری بات یہ کہ جب ان کے والد کا تبادلہ مہنڈر سے پونچھ میں ہوگیا تو کرشن چندر بھی ان کے ساتھ پونچھ چلے گئے۔ آٹھویں کلاس سے ہائی اسکول تک انہوں نے اپنی تعلیم پونچھ سے ہی حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر بارہ یا تیرہ برس کی تھی۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب بچہ نہ ہی بچہ رہتا ہے اور نہ ہی مکمل بالغ ہوتا ہے۔ اس عمر میں بچہ ہر چیز کو ایک الگ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کرشن چندر نے بھی پونچھ جیسی حسین ترین جگہ کو ایک نئی نظر سے دیکھا اور اس حسین ترین فطری علاقے سے بہت زیادہ متاثر بھی ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک کرشن چندر باحیات رہے پونچھ کی یادیں انہیں ستاتی رہیں۔ اپنے پونچھ کے دنوں کا ذکر کرشن چندر یوں کرتے ہیں :

''پونچھ کے دن میرے لیے بہتے پانی کے دن تھے اور سورج مکھی

کے پھولوں کی طرح آفتاب کے گرد طواف کرنے کے دن تھے۔
میں ایک زمین، ایک دھرتی، ایک شہر، ایک سیارہ تھا جو مسرت کے گرد چکر لگاتا تھا...... کتنے ہی راستے ہیں میرے دل میں جو پونچھ کی وادی کو جاتے ہیں کبھی شمال، کبھی مشرق، کبھی جنوب، کبھی مغرب جدھر سے بھی چلتا ہوں پونچھ پہونچ جاتا ہوں۔'' ۳۱

اوپر پیش کردہ اقتباس میں جس پونچھ کا ذکر کرشن چندر کرتے ہیں یہ ریاست پونچھ کا صدر مقام یعنی پونچھ کا شہر تھا اور آج بھی ہے۔ ان کے والد پونچھ کے صدر مقام پر ہی بحیثیت ڈاکٹر تعینات تھے۔ پونچھ کا یہ علاقہ ایک طرف سے مہنڈر اور دوسری طرف سے پیر پنجال کے برف پوش پہاڑی سلسلوں سے جڑا ہوا ہے۔ جنوب مشرق کی طرف سے دریائے سرن بہتا ہوا آتا ہے اور پونچھ شہر کے بالکل کنارے کو چھوتا ہوا اور شمال مغرب کی طرف بہتا ہوا پاکستانی مقبوضہ کشمیر کو نکل جاتا ہے۔ لہٰذا اس علاقے، اس سرزمین یا اس شہر کی خوبصورتی اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں پونچھ کا نقشہ یا تعارف بقول کرشن چندر پیش کرنا زیادہ مناسب محسوس ہوتا ہے۔ کرشن چندر لکھتے ہیں :

''بڑے ٹیڑھے ٹیڑھے کوہستانی کٹھن راستے ہیں۔ مگر جدھر سے بھی جاؤ جب پونچھ قریب آتا ہے تو دل کے دروازے کھلنے لگتے ہیں، پہاڑ پھٹنے لگتے ہیں، ایک طرف سے بیتاڑ کا دریا آتا ہے، دوسری طرف سے پونچھ کا دریا۔ جس وادی میں ان دونوں دریاؤں کا سنگم ہے وہیں پر پونچھ کا شہر ہے۔'' ۳۲

کرشن چندر نے بے شک یہاں تین سال ہی قیام کیا لیکن یہ قیام بھی ان کی زندگی میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ کرشن چندر کے لیے پونچھ کتنا اہم تھا اور انہیں اس خوبصورت خطے سے کس حد تک لگاؤ تھا اس بات کا اندازہ بھی انہی کے اس اقتباس

سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ کرشن چندر لکھتے ہیں :

''وہ تیس ہزار چہرے اس شہر کے! ان میں سے ہر ایک کو میں ذاتی
طور پر جانتا ہوں۔ کب اتنے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ کب
اتنے لوگوں کو ذاتی طور پر جاننا ممکن ہے؟'' ۳۳

انہوں نے پونچھ کی خوبصورتی اور قدرتی مناظر کا مشاہدہ بھی کیا اور اس سے محظوظ بھی ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں پونچھ روم سے بھی زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔ پونچھ کے متعلق یا شہر پونچھ کی خوبصورتی کے متعلق کرشن چندر اپنے سوانحی ناول میں یوں رقم طراز ہیں :

''خوبصورت روم سات ٹیلوں پر آباد ہے تو پونچھ بارہ ٹیلوں پر۔
شاید وہ اسی لیے مجھے روم سے خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔'' ۳۴

بے شک کرشن چندر نے اپنی زندگی کا کم حصہ پونچھ میں گزارا لیکن اگر انہیں کسی جگہ سے سب سے زیادہ لگاؤ رہا ہے تو وہ پونچھ ہی ہے۔ کرشن چندر نے پونچھ میں صرف تین سال گزارے ہیں لیکن ریاست پونچھ کے ساتھ انہیں زندگی بھر دلی لگاؤ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فلم ڈویژن نے ان پر ڈاکومینٹری فلم بنانی چاہی تو کرشن چندر خوشی خوشی اس فلم کی شوٹنگ کے لیے اپنے پورے خاندان کے ساتھ پونچھ گئے۔ حالانکہ ان کی زندگی کا اولین حصہ مہنڈر میں بھی گزرا تھا اور ان کو مہنڈر سے بھی بہت زیادہ لگاؤ تھا لیکن شوٹنگ کے لئے وہاں نہیں گئے۔ اس ڈاکومینٹری فلم کا اختصار بھی اس سفر کے دوران مہنڈر نہ جانے کی وجہ ہوسکتی ہے یا پھر مہنڈر نہ جانے کی وجہ وقت کی قلت یا کوئی دیگر وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صرف کرشن چندر کو ہی پونچھ سے لگاؤ نہیں تھا بلکہ اہل پونچھ کو بھی ان سے بہت زیادہ محبت تھی۔ جب کرشن چندر ۱۹۷۴ء میں پونچھ پہونچے تو اہل پونچھ نے ان کی خدمت میں دونوں ڈاک بنگلے پیش کر دیے۔ پھر اہل پونچھ نے ان کے ہمراہ ایک بہت بڑا جلوس بھی نکالا نیز ان کے احترام میں ایک بہت بڑی تقریب

کا بھی انعقاد کیا۔ جب کرشن چندر ۱۹۷۶ء میں پونچھ گئے تو وہ اس مکان کو بھی دیکھنے گئے جس میں وہ قیام پونچھ کے دوران رہائش پذیر تھے۔ وہ مکان اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کرشن چندر اس کھنڈر میں کچھ دیر بیٹھ کر روتے رہے۔ پرانی سبھی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے دل کا غبار ہلکا کیا اور پھر واپس آ گئے۔ اس حوالے سے جگدیش چندر ودھاون یوں لکھتے ہیں :

> ''کرشن چندر رو رہے تھے، مہندر ناتھ بھی دم بخود تھے، اوم اور سرلا کی آنکھیں نم ہو گئیں، سب نے انہیں فرطِ جذبات سے مغلوب ہوتا دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ جیسے وہ کسی غیر مرئی ہستی کے روبرو پیش ہوں۔'' ۳۵

یہ تھیں پونچھ کی وہ یادیں جنہوں نے ۴۵ سال بعد بھی کرشن چندر کو رونے پر مجبور کر دیا۔ یہاں اس واقعے کا بیان بھی اہمیت کا حامل ہے کہ جب ڈاکومینٹری فلم کی شوٹنگ کے لیے کرشن چندر اپنے پورے خاندان کے ساتھ پونچھ پہونچے تو دریائے پونچھ کے کنارے پہونچتے ہی انہوں نے گاڑی کو روک کر پہنے ہوئے کپڑوں سمیت پونچھ کے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ کافی دیر اس دریا میں ڈبکیاں لگاتے رہے اور جب دل کو سکون ملا تب دریا سے باہر آئے۔ دوسرا اہم اور قابل ذکر واقعہ یہ بھی ہے کہ جب کرشن چندر سلمیٰ صدیقی کو ہمراہ لے کر سویزرلینڈ کی سیاحت کو گئے تو سویزرلینڈ گھومنے کے بعد سلمیٰ صدیقی نے پوچھا کہ آپ کو کیسا لگا تو کرشن چندر کا جواب یہ تھا کہ ''سب کچھ بہت اچھا ہے، خوبصورت ہے لیکن پونچھ جیسا نہیں''۔ مذکورہ دونوں واقعات کا ذکر سلمیٰ صدیقی نے پروفیسر لیاقت جعفری کے ساتھ انٹرویو میں کیا ہے۔ یہاں یہ واقعہ بھی پیش کرنا اہم محسوس ہوتا ہے کہ جب کرشن چندر نے سلمیٰ صدیقی کے ساتھ اسلامی رسوم و قوانین کے مطابق نکاح کیا تو مولوی صاحب (نکاح خواں) نے کہا کہ آپ نے کلمہ

پڑھ کر بحیثیت مسلمان یہ نکاح کیا ہے اس لیے آپ کا مسلم نام رکھنا بھی ضروری ہے۔ مولوی صاحب نے ان کا نام اللہ راکھا تجویز کیا تو کرشن چندر نے اس نام کو اس لیے رد کر دیا کہ یہ پرانا سا نام مجھے پسند نہیں۔ انہوں نے خود اپنا نام وقار ملِک رکھا جو کہ نکاح نامے میں درج کیا گیا۔ انہوں نے اس نام کی وجہ یہ بتائی کہ وقار اور ملک نامی ان کے دو دوست تھے جو ان کے ساتھ پونچھ میں پڑھتے تھے۔ ان دونوں سے انہیں بہت محبت تھی لیکن وہ دونوں ان سے بچھڑ گئے۔ اس بات سے بھی ان کی پونچھ کے ساتھ محبت و عقیدت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

الغرض چاہے مہنڈر رہو یا پونچھ مجموعی طور پر ہم کشمیر ہی کہہ سکتے ہیں لہٰذا کشمیر کی یادیں انہیں برابر ستاتی رہیں۔ کشمیر سے انہیں بہت زیادہ محبت و وابستگی ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات پر فخر بھی تھا کہ وہ کشمیر کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوئے ہیں اور انہوں نے اس فطری آب و ہوا اور فضا میں وقت گزارا ہے۔ کرشن چندر کشمیر پر فخر کرتے ہوئے بہت زیادہ جذباتی ہو جاتے ہیں اور اپنے احساسات و جذبات اور اس فخر کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں :

> ''ماں کے سفید آنچل کی طرح چمکنے والی برف پوش ہمالیہ کی چوٹیوں نے مجھے جو سکون اور غرور دیا ہے اسے دنیا کی بڑی سے بڑی بے رحمی بھی نہیں مٹا سکتی۔ وہ لوگ جنہوں نے زندگی میں میری تضحیک کرنا چاہی، جنہوں نے مجھے اکیلا کر دینا چاہا، کبھی یہ جان نہ سکے کہ میں نے تو پہاڑوں سے دوستی کی ہے، میں نے برف کو چھوا ہے، میں بہتے پانی کے ساتھ گھوما ہوں۔ وہ مجھے کیا جانیں گے جنہوں نے دیواروں سے پیار کیا ہے۔'' ۳۶

کرشن چندر کے فطرت سے لگاؤ اور اس فطری فضا میں گزارے جانے والے وقت پر فخر کا

اندازہ ان کے مذکورہ اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ پونچھ سے ان کی وابستگی اور ذہنی وروحانی محبت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی وفات کے بعد، ان کو نذر آتش کرنے کے بعد ان کی استھیوں کو گنگا کی جگہ دریائے پونچھ میں بہایا جائے۔ لہٰذا ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے لواحقین نے ایسا ہی کیا۔

لاہور :

کرشن چندر میٹرک کے بعد لاہور چلے گئے اور وہاں زندگی کا ایک بڑا حصہ (یعنی ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۰ء تک) گزارا۔ وہیں سے انہوں نے ایف۔ایس۔سی، بی۔اے، ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور لاہور سے ہی ملازمت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس طرح کرشن چندر گیارہ سال تک لاہور سے وابستہ رہے۔ جن دنوں کرشن چندر لاہور میں قیام پذیر تھے ان دنوں لاہور ہندوستان میں علم و ادب اور تہذیب وثقافت کے مرکز کی حیثیت سے مشہور تھا۔ کرشن چندر کو بھی علم وادب سے بہت گہرا لگاؤ تھا لہٰذا انہیں لاہور کا ماحول بہت راس آیا۔ یہیں سے کرشن چندر نے سیاست میں بھی قدم رکھا اور یہیں سے انہیں ادبی سرگرمیوں میں بھی براہِ راست حصہ لینے کا موقع ملا۔ لاہور میں ہی ان کی ملاقات کنہیالال کپور اور اوپندر ناتھ اشک سے ہوئی۔ کنہیالال کپور کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم لاہور سے لے کر تاحیات قائم رہے۔ لاہور ہی میں انہوں نے کنہیالال کپور کے توسط سے اُن کے ناشر کے ہاں ملازمت بھی کی جو جلدی ہی چھوڑ دی۔ لاہور میں ہی آل انڈیا ریڈیو میں انہیں سرکاری ملازمت ملی۔ لاہور سے ہی انہوں نے پہلی شادی بھی کی۔ الغرض لاہور کے دن بھی ان کی زندگی کے اہم اور خوشگوار دن تھے۔ لاہور کی یادیں بھی انہیں زندگی بھر ستاتی رہیں اور تاحیات لاہور سے ان کی ذہنی وروحانی وابستگی قائم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر

لاہور جانے کے لیے زندگی بھر ترستے رہے۔ کرشن چندر کی لاہور سے محبت کے حوالے سے نند کشور وکرم نے لکھا ہے :

''لاہور کی یادیں انہیں تڑپاتی تھیں اور وہ پاکستان سے آنے والے دوستوں سے سوال کرتے تھے۔ جب محمد طفیل انہیں ملنے کے لیے آئے تو انہوں نے ان سے بڑی یاس وحسرت سے پوچھا تھا۔ کیا اب بھی شام کو ویسے ہی انارکلی میں رونق ہوتی ہے، کیا اب بھی شام کو ویسے ہی جوڑے بن سنور کر نکلتے ہیں، کیا اب بھی ویسے ہی چائے خانوں میں ادبی موضوعات پر باتیں ہوتی ہیں۔'' ۳۷

کرشن چندر کی لاہور سے وابستگی، محبت اور اعتماد کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب کرشن چندر بمبئی کے اسپتال میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے تو اس وقت سلمیٰ کو وصیت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر میرے بعد حالات ناموافق ہوئے تو تم پاکستان چلی جانا۔ وہاں میرے بہت سے دوست ہیں جو تمھیں پریشان نہیں ہونے دیں گے۔ اس بات کا ذکر جگدیش چندر ودھاون نے بھی تفصیل سے کیا ہے۔ بہ قول جگدیش چندر ودھاون :

''اُن سے کہتے ہیں کہ اگر میری موت کے بعد حالات قابو سے باہر ہوجائیں تو پاکستان چلی جانا وہاں میرے بہت سے دوست احباب ہیں جو سچ مچ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ تم وہاں اکیلی نہ رہو گی۔'' ۳۸

کرشن چندر کو کشمیر (یہاں کشمیر سے مراد مہنڈر اور پونچھ ہے جہاں ان کی ولادت بھی ہوئی اور ان کے طالب علمی کے نیز بچپن ولڑکپن کے شب وروز بھی گزرے) اور لاہور دونوں جگہوں سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ بے شک مالی حالت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ

سے ان کی آخری زندگی ممبئ میں ہی گزری نیز آزادی کے بعد یہ لاہور نہ جا سکے لیکن وہاں کی یادیں زندگی بھر ان کے ساتھ رہیں۔ کشمیر یعنی پونچھ جانے کا بھی موقع کرشن چندر کو ایک ہی بار (۱۹۷۴ء میں) ملا۔ لیکن انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے اس محبت کا فرض بخوبی نبھایا ہے۔ اس کے باوجود بھی لاہور اور پونچھ کے لیے کرشن چندر زندگی بھر تڑپتے رہے۔ ان کے لاہور اور کشمیر سے لگاؤ کا ذکر نند کشور وکرم یوں کرتے ہیں :

> ''کرشن چندر کی دو بڑی خواہشیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک بار لاہور جا سکیں اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی وفات سے دو تین سال پیشتر کشمیر کے کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی خودنوشت اور ٹالسٹائی کے ''وار اینڈ پیس'' کی طرح ایک بڑا شاہکار ناول لکھ سکیں مگر افسوس کہ ان کی دونوں خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔''[۳۹]

مختصر یہ کہ کرشن چندر مہنڈر و پونچھ کے ساتھ ساتھ لاہور سے بھی گیارہ برس تک وابستہ رہے ہیں۔ لہٰذا لاہور کی یادوں نے بھی انہیں زندگی بھر اپنی طرف متوجہ رکھا۔ یوں تو کرشن چندر محض گیارہ برس ہی لاہور سے وابستہ رہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ لاہور سے ان کی ذہنی و روحانی وابستگی ساری زندگی باقی رہی ہے۔

دِلّی، پونا اور بمبئ :

کرشن چندر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء تک ایک سال دلّی میں قیام پذیر رہے۔ آل انڈیا ریڈیو لاہور سے دلّی ان کا تبادلہ ہوا۔ دلّی میں کرشن چندر بھار گولین، تیس ہزاری میں قیام پذیر رہے۔ یہاں انہوں نے لگ بھگ ایک سال تک قیام کیا۔ اس کے بعد انہیں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ جانا پڑا۔ لیکن دلّی کا مکان ۱۹۹۰ء تک ان ہی کے کنبے کے پاس رہا۔ کرشن چندر کو جب بھی دلّی سے ہوتے ہوئے کہیں جانا پڑتا تو یہاں ٹھہر کر جاتے تھے کیونکہ ان کا باقی خاندان یہیں رہتا تھا۔ دلی میں کرشن چندر کو اپنی ہم

عصر بہت سی شخصیات سے بھی صحبت کا موقع ملا۔ یہاں بہت سے اہل ادب ان سے ملنے آتے تھے اور ادبی محفلوں کے ساتھ ساتھ شراب نوشی کے بھی مزے لیے جاتے تھے۔ دلّی کے دنوں کا اور یہاں کی ادبی محفلوں کا ذکر نند کشور وکرم یوں کرتے ہیں :

”یہیں انہیں ملنے کے لیے ہندوستان بھر کے شاعر اور ادیب آیا کرتے تھے۔ جن میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ن۔م۔راشد، ہنس راج رہبر، جگن ناتھ آزاد، سعادت حسن منٹو، ریوتی سرن شرما ایسی ہستیاں شامل تھیں۔“ ۴۰

دلّی میں ہی کرشن چندر اور سلمٰی صدیقی کی پہلی باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی۔اس سے پہلے ان کی سرسری سی ملاقات علی گڑھ میں ایک سیمینار میں ہو چکی تھی لیکن علی گڑھ میں اتنی فرصت ہی نہیں ملی اور نہ ہی اس سے پہلے ان کے درمیان کوئی رابطہ تھا۔ دلّی میں اسرار الحق مجاز سلمٰی صدیقی کو اپنے ہمراہ لے کر کرشن چندر کے گھر گئے اور وہاں ان کی باقاعدہ پہلی ملاقات ہوئی۔ جب کرشن چندر کی دوسری شادی سلمٰی سے ہوئی تب بھی کرشن چندر دلّی میں قیام پذیر تھے۔ ان کی دوسری شادی ۱۹۶۱ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے کرشن چندر ۱۹۶۰ء میں بمبئی سے دلّی آ گئے تھے اور ۱۹۶۲ء میں دوبارہ بمبئی چلے گئے۔لہٰذا دلّی سے بھی ان کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

دلّی کے بعد ان کا تبادلہ لکھنؤ میں ہوا۔ یہاں کرشن چندر لگ بھگ ایک سال تک رہے۔۱۹۴۲ء میں جب شالیمار پکچرز پونا کی طرف سے انہیں ملازمت کی پیش کش ہوئی تو کرشن چندر سرکاری ملازمت کو خیرباد کہہ کر پونا چلے گئے۔ کرشن چندر کا لکھنؤ سے لگاؤ بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ان کی تحریروں سے بھی ایسی کوئی نشاندہی نہیں ہوتی جو لکھنؤ سے ان کے لگاؤ کی شاہد ہو۔

پونا شالیمار پکچرز میں کرشن چندر نے کم وبیش چار سال کام کیا۔ یہ چار سال

ان کی زندگی کے یادگار ہیں ۔ یہاں ان کا وقت نہایت ہی شاندار اور آزادانہ گزرا۔ یہاں ایک طرف تو کام کا اتنا بوجھ نہیں تھا تو دوسری طرف کرشن چندر حسن پرست اور رومانی مزاج کے انسان تھے اور شالیمار پکچرز کا ماحول نہایت ہی رنگین تھا۔ پونا کی خوشگوار زندگی کا کرشن چندر اور مہندر ناتھ دونوں بھائیوں نے اپنی تحریروں میں بڑے خوشگوار انداز میں ذکر کیا ہے۔ کرشن چندر کی پونا کی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے جگدیش چندر ودھاون یوں رقم طراز ہیں :

> ''ادھر شالیمار پکچرز میں حسن و جوانی کی رنگینیاں اور رعنائیاں چھائی ہوئیں تھیں......کرشن چندر کو یہ بہشتی ماحول بہت سہانا لگا۔ رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کا ماحول ادبی بھی تھا...... گویا وہاں کا ماحول ادیبوں اور شاعروں کے لیے اپنے فن کو جلا دینے اور اپنی روح کو غذا مہیا کرنے کے واسطے بھی بڑا ساز گار تھا۔'' [۴۱]

بے شک پونا کا ماحول کرشن چندر کو پسند آیا لیکن ان کے تعلقات فلمی دنیا تک محدود تھے۔ اس کے علاوہ پونا سے کرشن چندر کو خاص لگاؤ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جلد ہی ایسے ماحول کو چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔

۱۹۴۶ء میں کرشن چندر بمبئی پہونچے اور باقی ماندہ زندگی بمبئی میں ہی بسر کی۔ حالانکہ بیچ میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک دو سال انہوں نے دوبارہ دلی میں قیام کیا ہے لیکن یہ قیام بہت ہی مختصر بھی تھا اور ایک خاص مقصد کے لیے بھی تھا۔ جب اس قیام کا خاص مقصد پورا ہو گیا تو انہوں نے دوبارہ دلی کو خیرباد کہہ کر بمبئی کی راہ لی۔ آخر کار بمبئی کے ہی ایک اسپتال میں ۸/مارچ ۱۹۷۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔ بمبئی سے انہیں کافی حد تک لگاؤ تھا کیونکہ بمبئی سے کرشن چندر لگ بھگ ۳۱ سال تک وابستہ رہے۔ جہاں زندگی کا اتنا بڑا حصہ گزرا ہو اس جگہ سے محبت ہونا تو فطری بات ہے۔ بمبئی میں کرشن

چندر نے اپنے بیٹے رنجن کے لیے ایک پرنٹنگ پریس بھی لگائی جس کا مقصد ایک طرف تو کتابوں کی اشاعت کے ذریعے تعلیم وادب کو فروغ دینا تھا تو دوسری طرف رنجن کا ذریعۂ معاش بھی تھا۔

کرشن چندر نے اپنی زندگی مختلف مقامات پر یکے بعد دیگرے گزاری اور مختلف مقامات سے وابستہ رہے لیکن اگر ان کو کسی جگہ سے روحانی وابستگی تھی تو وہ کشمیر (یعنی مہنڈر اور پونچھ) سے تھی۔ اس کے بعد لاہور سے بھی انہیں بہت زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر اور لاہور جانے کی خواہش انہیں ساری زندگی باقی رہی لیکن آلام روزگار نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا۔

حواشی

۱۔ کرشن چندر (مونوگراف)، جیلانی بانو، ص ۱۲، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۱۹۸۶ء
۲۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۴۱، کتابی دنیا دلی، ۲۰۰۳ء
۳۔ کرشن چندر (مونوگراف)، نند کشور وکرم، ص ۸۔۷، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۴ء
۴۔ کرشن چندر ایک نظر میں، نند کشور وکرم، ص ٦، مشمولہ ہمارا ادب، کرشن چندر نمبر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۱۴ء
۵۔ تذکرۂ ماہ وسال، مالک رام، ص ۳۱۵، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء
٦۔ کرشن چندر کے خطوط سہیل عظیم آبادی کے نام، ص ۵۲۷، مشمولہ کرشن چندر نمبر، شاعر ممبئی، ۱۹٦۷ء
۷۔ میری یادوں کے چنار، کرشن چندر، ص ۲۹۳-۲۹۲، ایشیا پبلشرز، دہلی، ۱۹٦۲ء
۸۔ سلمیٰ صدیقی کا ایک انٹرویو پروفیسر لیاقت جعفری کے ساتھ، یوٹیوب چینل Liaqat Jafri Official
۹۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ٦۳، کتابی دنیا دلی، ۲۰۰۳ء
۱۰۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۱۲۱، کتابی دنیا دلی، ۲۰۰۳ء
۱۱۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۱۹۲، کتابی دنیا دلی، ۲۰۰۳ء
۱۲۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۱۹۵، کتابی دنیا دلی، ۲۰۰۳ء
۱۳۔ کرشن چندر (مونوگراف)، نند کشور وکرم، ص ۴۲، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۴ء
۱۴۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۲۲۵-۲۲۴، کتابی دنیا دلی، ۲۰۰۳ء
۱۵۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۴۲-۴۱، کتابی دنیا

دلی،۲۰۰۳ء
۱۶۔ کرشن چندر (مونوگراف)، جیلانی بانو،ص ۱۲،ساہتیہ اکادمی دہلی،۱۹۸۶ء
۱۷۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۶۹، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۱۸۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون،ص ۵۵، کتابی دنیا دلی،۲۰۰۳ء
۱۹۔ میری یادوں کے چنار، کرشن چندر،ص ۱۳، ایشیا پبلشرز دہلی،۱۹۶۲ء
۲۰۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۱۵، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۲۱۔ میری یادوں کے چنار، کرشن چندر،ص ۲۴، ایشیا پبلشرز دہلی،۱۹۶۲ء
۲۲۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۱۷۱، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۲۳۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۶۹-۶۷، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۲۴۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۱۰۱-۱۰۰، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۲۵۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۱۷۱، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۲۶۔ کرشن چندر (مونوگراف)، جیلانی بانو،ص ۱۴،ساہتیہ اکادمی دہلی،۱۹۸۶ء
۲۷۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۱۶۹، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۲۸۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۱۷۱، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۲۹۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۱۷۱، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۳۰۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۱۷۰، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۳۱۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۵۲، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۳۲۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۵۳-۵۲، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۳۳۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۵۴، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۳۴۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر،ص ۵۶، یونین پرنٹنگ پریس دلی،۱۹۶۶ء
۳۵۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون،ص ۱۰۸، کتابی دنیا دلی،۲۰۰۳ء

۳۶؎ مٹی کے صنم، کرشن چندر، ص ۵۸، یونین پرنٹنگ پریس دلی، ۱۹۶۶ء
۳۷؎ کرشن چندر (مونوگراف)، ہند کشور وکرم، ص ۳۹، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۴ء
۳۸؎ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۲۰۱، کتابی دنیا دلی، ۲۰۰۳ء
۳۹؎ کرشن چندر (مونوگراف)، ہند کشور وکرم، ص ۵۷، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۴ء
۴۰؎ کرشن چندر (مونوگراف)، ہند کشور وکرم، ص ۲۳، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۴ء
۴۱؎ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۷۹، کتابی دنیا دلی، ۲۰۰۳ء

اُردو فکشن میں انفرادی خصوصیات

اُردو کے نثری ادب کی تاریخ اور خصوصاً اُردو کے افسانوی ادب کی تاریخ کرشن چندر کا ذکر کیے بغیر نامکمل ہے۔ کرشن چندر نے ایک طرف تو اُردو فکشن کو ترقی کی بلندیوں پر پہونچا دیا تو دوسری طرف انہوں نے اُردو ادب کی غیر افسانوی اصناف کو بھی شاندار نمونے دینے کے ساتھ ساتھ ترقی کے راستے پر گامزن کیا ہے۔ اُردو کے افسانوی ادب میں جو مقام پریم چند کا ہے اس سے بھی بلند مقام ہمیں کرشن چندر کا نظر آتا ہے۔ پریم چند کے احسانات بے شک افسانوی ادب کے حوالے سے ناقابلِ فراموش ہیں لیکن اس کے باوجود بھی پریم چند نے ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ ایک محدود دائرے میں رہ کر ہی لکھا ہے لیکن اس کے برعکس کرشن چندر کے ہاں فنی وموضوعاتی دونوں اعتبار سے رنگا رنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے فنی اعتبار سے روایتی کہانیاں بھی لکھیں اور روایت سے بغاوت کرتے ہوئے انہوں نے بہت سے کامیاب فنی تجربات بھی کیے۔ کرشن چندر نے کسی ایک راستے کو ہی اپنا راستہ نہیں بنایا اور نہ ہی کسی خاص نظریے کو اپنے اوپر حاوی ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات اکثر ادبی نظریات کی پیروی بھی کرتی ہیں اور فنی وموضوعاتی رنگا رنگی سے بھی عبارت ہیں۔ ان کی تخلیقات میں مختلف فنکاروں کی خصوصیات بھی اکھٹی ملتی ہیں نیز بہت سی ایسی خصوصیات بھی ان کے ہاں موجود ہیں جو آج تک اردو کے افسانوی ادب میں نایاب نہ بھی ہوں لیکن کم یاب ضرور ہیں۔ یہاں کرشن چندر کی انفرادیت کا جائزہ ان کی سبھی فنی وموضوعاتی خصوصیات کے حوالے سے الگ الگ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کیونکہ کرشن چندر کی ان فنی وموضوعاتی خصوصیات کو سامنے لانے کی اور ان خصوصیات پر گفتگو کرنے کی نیز ان کی ان سبھی خصوصیات کو ابھارنے کی ضرورت ہے جن فنی وموضوعاتی خصوصیات کی بنیاد پر کرشن چندر ایشیاء کے عظیم افسانہ نگار کہلائے۔

افسانوی ادب

اُردو کا افسانوی ادب کرشن چندر کے احسانات سے گرانبار ہے۔ کرشن چندر نے اُردو کے افسانوی ادب کو لاثانی اور رنگارنگ نمونے دیے ہیں جن پر اردو کے افسانوی ادب کو ناز ہے۔ انہوں نے اُردو ادب کو ساٹھ کے لگ بھگ ناول دیے ہیں اور ان میں بہت سے ناول شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بے شک ان کے کچھ ناول ادبی دنیا میں اپنا خاص مقام نہیں بنا سکے لیکن اس کے برعکس بہت سے ناول ایسے بھی انہوں نے اُردو ادب کو دیے ہیں جن کی مثالیں اُردو ادب میں نایاب نہ بھی ہوں لیکن کم یاب ضرور ہیں۔ ان کے ایسے ناولوں میں شکست، میری یادوں کے چنار، مٹی کے صنم، آسمان روشن ہے، ایک عورت ہزار دیوانے، آئینے اکیلے ہیں، اس کا بدن میرا چمن، برف کے پھول، پانچ لوفر، جب کھیت جاگے، سپنوں کی وادی، چاندی کا گھاؤ، چندا کی چاندنی، زرگاؤں کی رانی، دوسری برف باری سے پہلے، ستاروں کی سیر، سونے کا سنسار، اور غدار، وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ کرشن چندر کی ناول نگاری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے جگدیش چندر ودھاون لکھتے ہیں:

> ''اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ بسیار نویسی نے جتنا نقصان ان کی ناول نگاری کو پہنچایا ہے اتنا کسی دیگر صنف کو نہیں پہنچایا۔ بایں ہمہ یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ ان کے ناولوں میں بھی جواہر ریزے ملتے ہیں جو اردو ناول نگاری کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔'' [1]

اس طرح انہوں نے اُردو ادب کو بہت بڑا ذخیرہ بھی عطا کیا اور اُردو ناول نگاری کو ایک معیار بھی عطا کیا نیز اردو ناول نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ شاید ہی دنیا کی کسی زبان کو بھی کسی فنکار نے اتنے ناول دیے ہوں۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ اردو کے افسانوی ادب کو سب سے زیادہ ناول کرشن چندر نے

دیے ہیں۔ اس اعتبار سے اردو ادب میں خصوصاً اردو فکشن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ناولوں ہی کی طرح انہوں نے اُردو افسانہ نگاری کو بھی بامِ عروج تک پہونچایا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کی افسانہ نگاری ہی کی وجہ سے ان کی شہرت بین الاقوامی سطح تک بھی پہونچ چکی تھی۔ ان کی افسانہ نگاری ہی کی وجہ سے انہیں ایشیاء کا سب سے عظیم فنکار یا افسانہ نگار کہا جانے لگا تھا۔ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد بھی پچاس سے زائد ہے۔ کرشن چندر نے اُردو ادب کو پانچ سو سے زیادہ افسانے دیے ہیں۔ یہ افسانے مختلف فنی وموضوعاتی رنگارنگی کے حامل بھی ہیں اور یہی افسانے کرشن چندر کے عظیم فن کار ہونے کے شاہد بھی ہیں۔ کرشن چندر کے چند ناول اور اکثر افسانوی مجموعے ان کی زندگی میں ہی دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے تھے۔ اس بات سے بھی ان کے فنی کمالات اور ان کی عظمت وشہرت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ کالو بھنگی، مہالکشمی کا پُل، بالکونی، تائی ایسری، آدھے گھنٹے کا خدا، پورے چاند کی رات، دو فرلانگ لمبی سڑک، غالیچہ، جہلم میں ناؤ پر، گرجن کی ایک شام، اور زندگی کے موڑ پر، وغیرہ کرشن چندر کے ایسے افسانے ہیں جن پر صرف اُردو ہی نہیں بلکہ ہر زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ شاید ہی زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہو جس کو کرشن چندر نے اپنے افسانوں کا موضوع نہ بنایا ہو۔ انہوں نے رومانیت سے لے کر حقیقی زندگی تک اور مقامی سماجی مسائل سے لے کر بین الاقوامی مسائل نیز عالمی جنگوں تک اس دنیا کے ہر پہلو کو اپنے افسانوں میں کامیابی سے پیش کیا ہے۔ ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی طرح ہی انہوں نے ڈراما نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اُردو ادب کو شاندار ڈرامے بھی عطا کیے ہیں جن میں اکثر ریڈیائی ڈرامے ہیں۔ یہ ڈرامے انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران لکھے تھے جو وقتاً فوقتاً آل انڈیا ریڈیو سے نشر بھی ہوتے رہے۔ اس طرح کرشن چندر نے عمومی طور پر صنف ڈراما نگاری کو اور خصوصاً ریڈیائی ڈرامے کو بھی خاص فروغ دیا ہے۔ لہٰذا اُردو کے

افسانوی ادب میں کرشن چندر کا نام و مقام خاص اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ایک طرف تو اُردو افسانہ نگاری میں نہ صرف ہندوستان سے بلکہ پوری دنیا سے اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے تو دوسری طرف اُردو ادب کو اہم، معیاری اور کامیاب ناول بھی عطا کیے ہیں نیز اُردو ڈراما بھی کرشن چندر کے احسانات سے گرانبار ہے۔

غیر افسانوی ادب

کرشن چندر نے اُردو کے افسانوی ادب میں اہم اور مستند خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اردو کے غیر افسانوی ادب میں بھی قابلِ فخر کارنامے انجام دیے ہیں۔ یوں تو ان کے خطوط بھی ان کے غیر افسانوی ادب کا دامن وسیع کرتے ہیں لیکن جس صنف کے بانی ہونے کا شرف کرشن چندر کو حاصل ہے وہ اردو رپورتاژ نگاری ہے۔ بے شک یہ صنف بھی اردو ادب کو مغرب کی دین ہے لیکن اردو میں جس شخص نے سب سے پہلے اس صنف کو گلے لگایا وہ بھی کرشن چندر ہی تھے۔ انہوں نے اپنا پہلا رپورتاژ ''لاہور سے بہرام گلہ تک'' تخلیق کر کے اردو میں باقاعدہ رپورتاژ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ کرشن چندر کی رپورتاژ نگاری اور اردو کے پہلے رپورتاژ کے حوالے سے سلمان فیصل لکھتے ہیں:

> ''اُردو میں پہلا رپورتاژ جس تحریر کو تسلیم کیا گیا ہے وہ کرشن چندر کا ''لاہور سے بہرام گلہ تک'' ہے۔ یہ رپورتاژ لاہور سے بہرام گلہ تک کے سفر کی روداد پر مبنی ہے۔ گرچہ یہ روداد سفر ہے لیکن اس تحریر سے اردو میں رپورتاژ کی مستحکم بنیاد ہوتی ہے۔ لاہور سے بہرام گلہ تک ایک ایسا رپورتاژ ہے جس میں کرشن چندر کے شگفتہ انداز بیان اور دلکش پیرایہ اظہار کے نمونے جابجا نظر آتے ہیں۔'' [۲]

اس کے بعد بھی انہوں نے ''پودے'' اور ''صبح ہوتی ہے'' نامی دو دیگر رپورتاژ تخلیق کر کے اردو ادب میں اس نو وارد صنف کو ترقی کے راستے پر گامزن کیا۔ کرشن چندر کو دیکھتے ہوئے

دیگر ادیبوں نے بھی اس صنف کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس طرح اُردو میں رپورتاژ کا بھی ایک خاص ذخیرہ وجود میں آ گیا۔ لہٰذا اردو رپورتاژ کے بانی ہونے کا تاج کرشن چندر کے سَر پر ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر نے اردو ادب کو ایک شاندار سفرنامہ بھی دیا ہے جو ''ورق ورق کھوگئی زندگی میری'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جب مرکزی حکومت کے فلم ڈویژن نے کرشن چندر کی اہمیت اور ادب کے تئیں ان کی کوششوں و کاوشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان پر ڈاکومینٹری فلم بنانی چاہی تو اس کام کے لیے ان کے بھائی مہندر کا انتخاب کیا گیا اور یہ ساری ذمہ داری مہندر ناتھ کو سونپی گئی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں کرشن چندر اور ان کا خاندان پونچھ آئے اور غالباً آٹھ روز پونچھ میں قیام کرنے کے بعد بمبئی لوٹے۔ اسی سفر پونچھ کی یادگار ان کا یہ سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے میں جموں وکشمیر کے مختلف مقامات کا جغرافیائی تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے بچپن کی بہت سی یادوں کو اور دیگر ذاتی کوائف کو بھی پیش کیا ہے۔ کرشن چندر شناسی کے حوالے سے یہ سفرنامہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس طرح انہوں نے اردو کے افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی ادب میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کی وجہ سے اردو کے غیر افسانوی ادب کی تاریخ میں بھی انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

فنّی تجربات یا فنّی انقلاب

جب کرشن چندر نے اردو فکشن کی دنیا میں قدم رکھا تو فنّی اعتبار سے ان کے سامنے ایک متعین اور روایتی راستہ موجود تھا۔ شروع میں کرشن چندر نے اسی راستے کو اپنایا اور فنی اعتبار سے بالکل روایتی کہانیاں لکھیں لیکن جلد ہی انہوں نے اس بنے بنائے راستے کو ترک کرنا شروع کر دیا اور اپنا راستہ خود متعین کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اس طرح انہوں نے فنّی اعتبار سے عمومی طور پر اُردو فکشن کو اور خصوصی طور پر اُردو افسانے کو ایک نئے راستے

پر گامزن کیا۔ اس نئے راستے میں فنی وموضوعاتی رنگارنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کرشن چندر نے اُردو ناول اور افسانے کے روایتی فنی اصولوں کو اپنایا بھی اور نیست ونابود بھی کیا۔ انہوں نے بہت سے فنی تجربات کیے اور یہ تمام تجربات کامیاب بھی رہے۔ یہ روایتی فنی اُصولوں سے بغاوت صرف بغاوت نہیں تھی بلکہ یہ کرشن چندر کی روشن خیالی اور جدّت پسندی تھی جسے ہم روایتی فنی اصولوں سے بغاوت اور فنی انقلاب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کرشن چندر کی اس فنّی بغاوت یا فنی انقلاب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے محمد حسن عسکری لکھتے ہیں :

> ''کرشن چندر نے افسانے کے مسلمہ اُصولوں کو ایسی بے اعتنائی سے کُچلا ہے کہ ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور ہم اسے ان ہی پرانے پیمانوں سے ناپنے لگتے ہیں'' [۳]

کرشن چندر نے ان فنی تجربات کو اپنے ناولوں میں بھی آزمایا ہے اور افسانوں میں بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناولوں میں ایسے تجربات کم ملتے ہیں جبکہ افسانوں میں فنی انقلاب یا فنی تجربات زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کرشن چندر کے فنی تجربات کے حامل افسانوں میں ان داتا، پشاور ایکسپریس، غالیچہ، دو فرلانگ لمبی سڑک، زندگی کے موڑ پر، مثبت ومنفی، گڑھا، چوراہے کا کنواں، مردہ سمندر، اور سپنوں کے اشارے، جیسے افسانوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ''ان داتا'' میں انہوں نے افسانے کے روایتی اُصولوں سے بغاوت کرتے ہوئے خطوط کی ٹکنیک اپنا کر قحطِ بنگال کا ہوبہو نقشہ پیش کیا ہے۔ ''پشاور ایکسپریس'' میں انہوں نے ریل گاڑی کو راوی بنا کر اس ریل کی زبانی تقسیم اور فساد سے پیدا شدہ انسانیت شکن مسائل اور عوام کے قتل عام نیز انسانیت کی بے حرمتی کو دکھایا ہے۔ ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' میں انہوں نے ایک سڑک کو اسٹیج بنا کر سماج کے مختلف انسانوں کو اور ان کے مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ زمانے کے مصائب اور اس دنیا واہل دنیا کی بے حسی کو پیش کیا ہے۔ ''غالیچہ'' میں انہوں نے ایک غالیچے کے مختلف رنگوں کی

نسبت سے بے حس اور عارضی و بے ثبات دنیا کے حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کے موڑ پر، گڑھا، چوراہے کا کنواں، مردہ سمندر، اور سپنوں کے اشارے، ان کے ایسے افسانے ہیں جنہیں ہم تجریدی اور علامتی افسانوں کی صف میں شمار کر سکتے ہیں۔فنی تجربات یا فنی انقلاب کے حوالے سے اگر ان کی ناول نگاری پر بات کی جائے تو یہاں پر بھی ہمیں کامیاب فنی تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ایک گدھے کی سرگزشت، گدھے کی واپسی، اور ایک گدھا نیفا میں، ایسے ناول ہیں جو طنزیہ شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ شاندار فنّی تجربات یا فنی انقلاب سے بھی عبارت ہیں۔ ان تینوں ناولوں کا راوی ایک گدھا ہے جس کی زبانی کرشن چندر نے دنیا کی عیاری و مکاری اور نامساعد حالات کو پیش کیا ہے۔ان تینوں ناولوں میں جو شہرت ان کے پہلے ناول یعنی ''ایک گدھے کی سرگزشت'' کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کے علاوہ ''میری یادوں کے چنار'' اور ''مٹی کے صنم'' دو ناول ایسے ہیں جو خودنوشت کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔انہیں ہم سوانحی ناول قرار دے سکتے ہیں۔ اردو ادب میں سوانحی ناولوں کا تجربہ بھی انہوں نے کیا جو کافی حد تک کامیاب اور دلچسپ رہا۔مختصر یہ کہ انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں بہت سے فنی تجربات کیے ہیں جو کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اردو فکشن میں ایک فنّی انقلاب برپا کر دیا۔کرشن چندر کی اسی فنی رنگارنگی اور فنی انفرادیت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں :

> ''کرشن چندر کے سرمایۂ ادب میں اسلوب واظہار، ٹکنیک اور ہیئت کے جو رنگا رنگ تجربے ملتے ہیں اگر اُردو افسانوی ادب کے سارے تجربات کو یکجا کیا جائے تب بھی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے کرشن چندر کا پلہ بھاری رہے گا...... کرشن چندر کی ہر

کامیاب کہانی اپنے آپ میں ایک آزاد، جامع، منفرد اور مکمل
تجربہ ہے'' ۲؎

فنی اعتبار سے ہمیں کرشن چندر کی تخلیقات میں روایتی اُصولوں کی پابند تخلیقات بھی ملتی ہیں اور روایت شکن بھی، یہاں ہمیں شعور کی رو کا استعمال بھی کم وبیش ملتا ہے اور فلیش بیک کا استعمال بھی، ان کی تخلیقات میں ہمیں تجریدی افسانے بھی ملتے ہیں اور علامتی کہانیاں بھی، ان کے ہاں ہمیں راوی ایک گدھا بھی ملتا ہے اور ایک ریل گاڑی بھی یا دس روپے کا نوٹ بھی کہانی کا راوی ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں ہمیں کہانی کا مرکز ومحور ایک غالیچہ بھی ملتا ہے اور ایک سڑک بھی ان کی کہانی کا مرکز ہے۔ الغرض کرشن چندر نے بہت سے فنی تجربات کیے ہیں اور ان تجربات میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کا تعلق اگر کسی تحریک یا نظریے سے تھا تو وہ ترقی پسند تحریک اور اشتراکی نظریہ ادب تھا لیکن اس کے باوجود بھی ہمیں ان کے افسانوں میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی خصوصیات بھی دکھائی دیتی ہیں۔ شاید ترقی پسند ادیبوں کو یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یقیناً ترقی پسند ادیبوں کو بھی ان سے اس بات کا گلہ ضرور رہا ہوگا۔

رومانیت اور حقیقت

یوں تو رومانیت اور حقیقت نگاری دو مختلف اور متضاد رجحانات ہیں نیز کرشن چندر سے پہلے اور بعد بھی یہ دونوں رجحانات ایک دوسرے کے متضاد ہی رہے ہیں۔ ان سے پہلے بھی اور بعد بھی کسی ادب پارے میں جہاں سماجی حقیقت نگاری دیکھنے کو ملتی ہے وہاں رومانیت تلاش کرنا یا رومانی ماحول وفضا کی امید کرنا فضول ہے۔ اسی طرح جن تخلیقات میں رومانیت دیکھی جاسکتی ہے وہاں سماجی حقیقت نگاری ناپید ہے۔ کرشن چندر کے زمانے میں اور خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کی نظر میں تو رومانیت ایک گالی سے کم نہیں تھی۔ ایسے دور میں اور ان حالات میں ایک ایسے ادیب کے لیے رومانیت کو اپنانا جو

خود ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کا اہم ستون ہو کوئی عام بات نہیں تھی لیکن کرشن چندر نے ایسا کر دکھایا ہے۔ انہوں نے رومانیت اور حقیقت دونوں جو دو متضاد رجحانات یا خصوصیات ہیں کو ایک ہی جگہ خوبصورتی سے استعمال کر کے دکھایا ہے۔ ان کا اکثر ادب اسی رومانیت اور حقیقت کی آپسی آمیزش سے عبارت ہے۔ حقیقی حالات یہاں تک کے اشتراکی حقیقت نگاری میں بھی رومانیت پیدا کرنا اور رومانی پہلو نکال لینا نیز رومانی فضا میں بھی زندگی کے حقائق اور تلخ سچائیوں کو شاندار طریقے سے پیش کرنا کرشن چندر کا کمال ہے اور یہی ان کی انفرادیت بھی ہے۔ ان کے ہاں ہمیں سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت اور رومانی فضا بھی ملتی ہے نیز پریم چند کی حقیقت نگاری بھی لیکن یہ دونوں الگ الگ نہیں بلکہ ہمیں کرشن چندر کی تخلیقات میں یہ دونوں خصوصیات و کیفیات ایک دوسرے سے شیر و شکر ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا کرنا بے شک کرشن چندر کا کمال ہے اور کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ کرشن چندر کی رومانیت اور حقیقت نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں :

> ''انہیں حسن سے بھی لگاؤ ہے اور زندگی بھی عزیز ہے۔ چونکہ زندگی خود ایک حقیقت ہے اور رومان دوسری حقیقت ہے۔ اس لیے کرشن چندر ان بظاہر دو مختلف بلکہ متضاد حقیقتوں کو ایک وحدت کی شکل میں پیش کرتے ہیں''۔ ۵

جب ہم رومانیت کی مکمل تعریف و تعارف کو اپنے ذہن میں رکھ کر کرشن چندر کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی ہر تخلیق میں ہمیں رومانیت نظر آتی ہے۔ ان کی ایسی کوئی بھی تخلیق نہیں جہاں رومانیت کا دخل نہ ہو، چاہے وہ ان کی افسانوی تخلیقات ہوں یا غیر افسانوی تخلیقات ہوں۔ اسی طرح ان کی کوئی تخلیق ایسی بھی نہیں ملتی جس میں سماجی حقائق اور مسائل کی پیشکش نہ ہو یا ان کی ایسی کوئی بھی تخلیق نہیں ہے جس میں ان کا

اشتراکی نظریہ کم وبیش نہ پایا جائے۔اس طرح انہوں نے اپنی تخلیقات میں اشتراکی نظریہ ادب کو اپناتے ہوئے اشتراکی نظریہ حیات کی بھی تبلیغ کی ہے نیز انہوں نے اپنی تخلیقات کو رومانیت کی فضا آفرینی اور رنگا رنگی سے بھی مالا مال کیا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ جو رومانیت دیگر فنکاروں کے ہاں ایک عیب بن جاتی ہے وہی رومانیت کرشن چندر کے ہاں ہنر بن جاتی ہے اور کرشن چندر کو اس ہنر کا استعمال کرنا بخوبی آتا ہے۔ان کا رومانی نظریہ دیگر رومانی ادیبوں سے بالکل مختلف ہے۔کرشن چندر کی رومانیت اور حقیقت نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشعل سلطانپوری لکھتے ہیں :

''انہوں نے کچھ رومانی مکتب خیال سے وابستہ افسانہ نگاروں کے زیر اثر اور کچھ اپنی افتاد طبع کی بنا پر رومانی افسانہ نویسی سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا ہے۔لیکن یہ رومانیت نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کی سی رومانیت نہیں۔ ان کی رومانیت کسی خیالی جنت میں پناہ لینے کی آرزو کے بجائے اس زندگی کے حسین پہلوؤں سے پیار کرنا سکھاتی ہے اور اس زندگی کو بہتر بنانے کی ترغیب دیتی ہے'' ۶

کرشن چندر نے حقیقت نگاری کی طرف بھی خاص توجہ دی ہے اور زندگی کے ہر شعبۂ حیات کے حقائق کو پیش کیا ہے۔کچھ تخلیقات میں کرشن چندر زندگی کے حقائق کو پیش کرتے ہوئے اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں کہ براہِ راست تقریر کرنے لگتے ہیں اور ان کا اشتراکی نظریہ بھی صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہے۔ایسی صورت حال میں بھی قاری ان کی تخلیقات سے اُکتاتا نہیں بلکہ قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔اس کا راز یہی ہے کہ ان کی اشتراکی حقیقت نگاری میں بھی رومانیت پیچھے پیچھے رہتی ہے اور ان کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اس طرح ان کی رومانیت روزمرہ زندگی کے حقائق اور سماج کے تلخ مسائل سے ہم آہنگ

ہوکر ایک سماجی حقیقت بن جاتی ہے۔ان کی اس حقیقی رومانیت یا تلخ حقائق اور رومانیت کی ہم آہنگی کا اعتراف کرتے ہوئے محمد حسن عسکری اس نتیجے پر پہونچتے ہیں :

"اس سچی رومانیت کے معنی ہیں زندگی اور انسانیت سے گہری محبت، فطرت کا شدید احساس، انسان کے مستقبل کو روشن بنانے کی آرزو، دنیا کے ظلموں کے خلاف بغاوت، انسانوں کی روحوں کو سمجھنے کی صلاحیت، ان کے مصائب پر غم کھانا، دنیا کے دُکھ درد کو یکسر مٹا دینے کی خواہش، ایک نئی اور بہتر دنیا کی تلاش، حسن اور حقیقت کی جستجو" ۷

کرشن چندر سے پہلے بھی اردو میں بہت بڑا رومانی ادب وجود میں آ چکا تھا لیکن اس وقت تک فنکار یا کوئی بھی ادبی تخلیق جو رومانی کہلاتی تھی وہ حقیقت سے بعید تھی اور جو تخلیق سماجی حقیقت نگاری سے عبارت تھی وہ رومانیت سے بعید تھی لیکن کرشن چندر نے ان دونوں متضاد رجحانات کو آپس میں شیر وشکر کر دیا۔ دوسری بات یہ کہ کرشن چندر سے پہلے کی رومانیت اکثر خواب پرستی، ماضی پرستی اور عریاں جنسی جذبات ومعاملات سے عبارت تھی نیز ان سے پہلے رومانیت یا رومانی ادب کسی ایسی دنیا کا طلبگار تھا جس کا وجود ابھی تک اس مادی دنیا میں نایاب ہے۔ کرشن چندر نے ان خوابوں کو توڑ کر اور اس طلسماتی فضا کو نیست ونابود کرتے ہوئے ہمارے سماج اور روزمرہ زندگی سے عمدہ اور معیاری رومانیت کے نمونے پیش کیے ہیں۔ کرشن چندر کی تخلیقات میں پائی جانے والی رومانیت کا تعلق کسی خیالی دنیاء سے نہیں ہے بلکہ ان کی رومانیت اسی مادی دنیاء کی ایک حقیقت ہے۔ اس حوالے سے کرشن چندر کا کمال یہ ہے کہ وہی رومانیت جو ان سے پہلے ادب میں گالی یا بیہودگی کے مترادف تھی اب وہی رومانیت ان کے ہاتھوں میں پہونچ کر فنی حسن کہلائی جانے لگی۔ اس طرح کرشن چندر نے رومانیت کو ایک خاص معیار عطا

کرتے ہوئے اور اردو ادب کے اندر ایک صحت مند رومانیت کو متعارف کراتے ہوئے اُردو ادب میں اس رجحان کو ارتقاء کے راستے پر گامزن کیا۔ کرشن چندر نے جنس کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے اور یہ وہ جذبہ ہے جو صرف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ ہر جاندار میں پایا جاتا ہے۔ اردو ادب یا فکشن کے اندر جنسی مسائل کی پیشکش کے لیے منٹو اور عصمت اپنی مثال آپ ہیں لیکن ان کے ہاں جنسی مسائل کو اس طرح برملا پیش کیا گیا ہے کہ ان کے جنسی مسائل یا اس نوعیت کے افسانے فحاشی کی حدود میں داخل ہو کر اخلاقی حدود و قیود اور اقدار کو نیست و نابود کرتے ہیں لیکن کرشن چندر کی جنس نگاری مذکورہ دونوں فنکاروں سے مختلف و منفرد ہے۔ کرشن چندر نے سماج کے بہت سے جنسی مسائل کو بھی اُبھارا ہے اور کامیابی سے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے لیکن یہاں کرشن چندر عریانیت و فحاشی کی جگہ پاکیزگی اور تقدّس کا خاص خیال رکھتے ہیں اور یہی تقدس و پاکیزگی ان کی رومانیت کی جان ہے، ان کی رومانیت کا معیار ہے، اور کرشن چندر کی انفرادی خصوصیت بھی ہے۔ اس طرح کرشن چندر نے اردو ادب میں رومانیت کو ایک خاص معیار بخشا اور ایک معیاری و صحت مند رومانیت کے فروغ و ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ کرشن چندر کے اس منفرد رومانی معیار کا اکثر کرشن چندر شناسوں کو بخوبی اندازہ ہے۔ اسی حوالے سے بات کرتے ہوئے شکیب نیازی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

> ''کرشن چندر کا ادب پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے رومانیت کے تصور کو ازسرِ نو جلا بخشی اور اسے حقیقت سے ٹکرا کر اس قابل بنا دیا کہ اب رومان بجائے گالی کے ایک بہت بڑا وصف اور ہنر شمار ہونے لگا۔ ورنہ یہی رومانیت ناپختہ اور غیر توانا ہاتھوں میں پڑ کر محض جنسی چٹخارے کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی تھی'' ۸

کرشن چندر نے انسانی زندگی اور ہمارے سماج کے مختلف مسائل کو شاندار

طریقے سے پیش کیا ہے۔ کرشن چندر مارکسی تھے اورانہوں نے مارکسی حقیقت نگاری کے شاندار نمونے پیش کیے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسی حقیقت نگاری میں رومانی فضا بھی قائم کی ہے ۔ اس طرح انہوں نے ایک طرف تو رومانیت اور حقیقت کو یکجا کرتے ہوئے ان دونوں کو آپس میں اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ سماج کے سبھی مسائل اپنی اصل خوبصورتی و بدصورتی اور خوشحالی و بدحالی کے ساتھ ان کی تخلیقات میں جلوہ گر ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف انہوں نے رومانیت کو ایک محدود دنیا سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا اور رومانیت کو ایک خاص معیار عطا کیا۔ یہی معیار ان کی رومانیت کی پہچان، ان کے فن کی جان اوران کی فنی انفرادیت ہے۔

موضوعاتی تنوع اور رنگارنگی

کرشن چندر وہ فنکار ہیں جنہوں نے اُردو ادب کو اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ تخلیقات دی ہیں بلکہ یہ دعویٰ بھی بے جا نہ ہوگا کہ آج تک اردو فکشن کو جس فنکار نے سب سے زیادہ تخلیقات دی ہیں اس فنکار کا نام کرشن چندر ہے۔ اس طرح بسیار نویسی بھی ان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی چند معمولی خامیوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ کرشن چندر جتنے زیادہ بسیار نویس تھے اتنی ہی زیادہ ان کے ادب میں موضوعاتی رنگارنگی ملتی ہے۔ اردو کے نثری ادب میں اگر دیکھا جائے خصوصاً افسانوی ادب میں تو ہمیں اکثر ادیب ایسے نظر آئیں گے جنہوں نے زندگی کے کسی ایک پہلو کو اپنی تخلیقات کا خاص مرکز بنایا ہے اور زندگی یا سماج کے اس ایک ہی پہلو کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے لیکن کرشن چندر نے ان سبھی موضوعات کو اپنایا ہے یا اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے جن کا تعلق انسانی زندگی اور سماج سے ہے۔ ان کے ہاں ہمیں نذیر احمد کی اصلاح بھی ملے گی اور یلدرم کی رومانیت بھی، ان کی تخلیقات میں ہمیں پریم چند کی حقیقت نگاری اور ہندوستانی کسان و مزدور بھی ملتا ہے نیز

آزاد ورسوا کی طرح تہذیبی بحران کی پیشکش بھی ملتی ہے، یہاں ہمیں قراۃ العین حیدر کی اقدارِ حیات اور اقدار ادب بھی ملتی ہیں اور عصمت ومنٹو کے جنسی مسائل اور طوائف کلچر بھی، نیز اس کے علاوہ بھی کرشن چندر نے زندگی کے ہر پہلو اور سماج کے ہر معاملے کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ اسی حوالے سے کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر بات کرتے ہوئے سیّد احتشام حسین لکھتے ہیں :

> ''تو مجھے کرشن چندر اس لیے پسند ہیں کہ ان کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع بہت ہے۔ واقعات فارمولوں سے نہیں زندگی کے مشاہدے سے افسانوں میں جگہ پاتے ہیں۔ دوسرے افسانہ نگار بھی زندگی ہی سے اپنا مواد حاصل کرتے ہیں لیکن ان کے یہاں یہ تنوع نہیں ہے'' [9]

مختصر یہ کہ کرشن چندر نے شاید ہی کوئی ایسا موضوع نہ اپنایا ہو جس کا تعلق ہمارے روزمرہ سماج اور زندگی سے ہو۔ انہوں نے مقامی اور گھریلو سطح سے لے کر بین الاقوامی اور آفاقی سطح تک کے ہر مسئلے کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ کرشن چندر کشمیر کی خوبصورت فضا میں آنکھ کھولتے ہیں تو یہاں کی خوبصورت اور فطری فضا کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتے ہیں۔ اس فطری حسین اور خوبصورت فضا کا شاندار نقشہ اپنے دونوں سوانحی ناولوں کے علاوہ کئی افسانوں میں بھی پیش کرتے ہیں۔ جب اس خوبصورت فضا اور جنت نشاں سرزمین پر ڈوگرہ شاہی خاندان کے مظالم اور اس خوبصورت وادی کے باشندوں کی مفلسی، بے بسی اور خستہ حالی کا انہیں احساس ہوتا ہے تو ان حالات کو اپنے ناولوں، شکست، میری یادوں کے چنار، مٹی کے صنم، برف کے پھول، اور سپنوں کی وادی وغیرہ میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان حالات و مسائل کو کرشن چندر اپنے بہت سے افسانوں میں بھی موضوع بناتے ہیں اور ''سرائے کے باہر'' نامی ڈرامے میں بھی یہاں کے انسانوں کی بے بسی اور امراء کے مظالم کو پیش کیا جاتا ہے۔ جب ملک تقسیم ہوتا ہے اور

مذہبی فساد میں لاکھوں جانیں چلی جاتی ہیں تو یہاں بھی کرشن چندر اس فساد، انسانی جانوں کے نقصان اور انسانیت کی بے حرمتی کو موضوع بناتے ہیں۔ اس حوالے سے کرشن چندر نے پنجاب، کشمیر، پونچھ، دلّی اور بمبئی ہر جگہ کو الگ الگ اپنی تخلیقات میں موضوع بنایا ہے اور ان مسائل و مصائب کی شاندار عکاسی کی ہے۔ کرشن چندر نے ہندوستانی عوام کی بھوک کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور اس انسانی بھوک کا ذمہ دار انسانوں کے ساتھ ساتھ بھگوان کو ٹھہراتے ہوئے بھگوان کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے دادر پُل کے بچّے، پرماتما، پرانے خدا اور بھگوان کی آمد وغیرہ جیسی تخلیقات کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے عورت کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے عورت کی بے بسی کو بھی پیش کیا ہے اور عورت کی بہادری و ایثار کو بھی بیان کیا ہے نیز عورت کی عیاری و مکاری کا اندازہ بھی ان کی تخلیقات سے بخوبی ہوتا ہے۔ کرشن چندر کا موضوع کالو بھنگی بھی بنتا ہے جِسے پورا سماج انسان ماننے کے لیے بھی تیار نہیں اور ان کے افسانے کا موضوع وہ ساری عورتیں اور ان کی زندگیاں بھی بنتی ہیں جن کی پرانی ساڑیاں ان کی زندگیوں کی نمائندگی کرتی ہوئیں مہالکشمی کے پُل پر لہرا رہی ہیں اور ہم سے سوال کر رہی ہیں کہ ہم اس پل کے کس طرف ہیں یعنی جس طرف امراء کے محل ہیں اس طرف ہیں یا جس طرف اس نچلے طبقے کی جگیاں ہیں اس طرف ہیں۔ کرشن چندر ہمارے ملک میں ہونے والی بھنگیوں کی ہڑتال، بمبئی میں ہونے والی مزدوروں کی ہڑتال اور تلنگانہ میں چلنے والی کسان تحریک اور ان تینوں طبقوں پر ہونے والے مظالم کو بھی اپنا موضوع بناتے ہیں اور عالمی جنگوں سے ہونے والے نقصانات اور ان جنگوں سے پیدا شدہ خطرات اور ماحولیاتی آلودگی کو بھی اپنا موضوع بناتے ہیں نیز سائنس کی ترقی اور اس ترقی سے مستقبل میں ہونے والے حادثات سے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے پہاڑی قبائلی طبقوں کی زندگی، طرزِ زندگی، شرافت و سادگی کو بھی موضوع بنایا ہے اور بمبئی جیسے

شہروں میں رہنے والے عیار و مکّار، دھوکے باز اور عیش پرست انسان بھی ان کی تخلیقات میں جلوہ گر ہیں۔ یہاں ہمیں عشق ومحبت اور رومانی فضا بھی ملتی ہے اور تقسیمِ ہند، تقسیمِ کشمیر نیز ہجرت وجدائی کا درد وکرب بھی ملتا ہے۔ الغرض ہمارے سماج کا چھوٹے سے لے کر بڑے تک کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے اور زندگی کا ایسا کوئی شعبہ نہیں ہے جس کو کرشن چندر نے اپنے ناولوں یا افسانوں کا موضوع نہ بنایا ہو۔ اس طرح کرشن چندر زندگی کے ہر پہلو کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتے ہیں۔ لہٰذا ان کی تخلیقات میں موضوعاتی تنوع اور رنگارنگی اپنی انتہا کو ہے نیز یہ موضوعاتی تنوع اور موضوعاتی رنگارنگی بھی کرشن چندر کی پہچان اور ان کی انفرادیت ہے۔

کشمیر کی عکاسی

کرشن چندر کی پیدائش بھی پونچھ میں ہوئی تھی اور ان کا بچپن ولڑکپن بھی ریاست پونچھ میں گزرا تھا۔ انہوں نے کشمیر کو بہت قریب سے دیکھا، جانا پہچانا اور سمجھا تھا۔ کرشن چندر اس سرزمین سے بہت زیادہ یعنی جنون کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں اکثر کشمیر اور پونچھ کو شاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ کرشن چندر کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی ولادت بھی پونچھ کی ہے اور ان کا بچپن بھی پونچھ میں گزرا ہے نیز پونچھ اور اہلِ پونچھ کو بھی کرشن چندر پر فخر ہے کہ اس عظیم فنکار کی نسبت اس شہر اور اس علاقے سے ہے۔ یہاں اس بات کا اعتراف بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ کرشن چندر کے کشمیر سے مراد اکثر ریاست پونچھ ہی ہوتی ہے اور اسی علاقے کو انہوں نے اپنی تخلیقات میں زیادہ تر پیش کیا ہے۔ کشمیر کے حوالے سے انہوں نے یہاں کے تین اہم پہلوؤں کو شاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ تین پہلو یہاں کی سیاسی صورتِ حال، تہذیبی خصوصیات اور جغرافیائی خدوخال ہیں۔

جس وقت کرشن چندر ریاست پونچھ میں قیام پذیر تھے اس وقت ریاست

پونچھ کی باگ ڈور مہاراجہ پونچھ کے ہاتھوں میں تھی اور مجموعی طور جموں وکشمیر پر ڈوگرہ شاہی خاندان کا راج تھا۔ اس دور میں عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ چاہے ڈوگرہ شاہی خاندان ہو یا مہاراجہ پونچھ ہو، شاہانہ طبقے کے مظالم اپنی انتہا کو تھے۔ امراء طبقہ جسے چاہے جینے کا حق دے سکتا تھا اور جسے چاہے موت کے گھاٹ اُتار رہا تھا۔ کسی کی بیوی اور بہن ہو یا زمین کا خوبصورت ٹکڑا ہو یا کوئی دوسری خوبصورت یا کارآمد چیز ہو، شاہانہ طبقہ اور امراء ان چیزوں کو بغیر کسی خوف یا ڈر کے اپنی ذاتی ملکیت میں شامل کرسکتے تھے اور اگر کوئی اس نظام کے خلاف آواز بلند کرتا تھا تو اس کی سزا موت ہوتی تھی۔ اس دور کے ان سبھی مسائل و مظالم کو کرشن چندر نے بہت قریب سے دیکھا ہے یہاں تک کہ ان مظالم کا شکار کرشن چندر خود بھی ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے سوانحی ناول میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے کہ ان کے والد ڈاکٹر تھے جن کا مہاراجہ پونچھ کے قلعے میں آنا جانا رہتا تھا۔ ایک بار اپنے والد کے ہمراہ کرشن چندر بھی مہاراجہ کے ہاں گئے جب ان کی عمر تقریباً دس سے بارہ برس تھی۔ کرشن چندر کے پاس ایک خوبصورت چاقو تھا جو ان کے کسی دوست نے انہیں تحفے میں دیا تھا۔ مہاراجہ کے چھوٹے بچے کو یہ چاقو پسند آگیا اور اس نے کرشن چندر سے یہ چاقو چھین لیا۔ جب کرشن چندر نے اپنا چاقو واپس لینا چاہا تو انہیں اپنے والد سے اس لیے دو تھپڑ کھانے پڑے کہ مہاراجہ کے بیٹے کو جو پسند آجائے وہ رکھ سکتا ہے اور آپ کو اپنی چیز واپس مانگنے یا چھیننے کا کوئی حق نہیں۔ اس حوالے سے دوسرا واقعہ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے والد کو راجہ نے کہا کہ آپ بحیثیت ڈاکٹر کسی آدمی کو علاج کے بہانے زہر کا ٹیکا لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیں لیکن ان کے والد یعنی ڈاکٹر نے اس شخص کو مارنے کی جگہ اس کا علاج کرنے کے بعد اسے وہاں سے بھگا دیا۔ اس عمل کی سزا کے طور پر راجہ کی طرف سے پہلے تو ڈاکٹر صاحب کو مار دینے کا فیصلہ ہوا۔ بعد میں کسی کی سفارش کی وجہ سے ان کی جان تو بخش دی گئی لیکن انہیں ۲۴ گھنٹوں کے اندر اس علاقے

سے بے دخل ہو جانے کا سختی سے حکم ہوا۔ اس طرح کرشن چندر کے والدین کو اپنا گھر اور گھر میں موجود سبھی ساز و سامان چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔ اس واقعے کو کرشن چندر نے اپنے ناول میں اس طرح بیان کیا ہے :

> ''میرے باپ نے میری ماں سے گلوگیر لہجے میں کہا۔'' کاکے دی ماں! سارا سامان یہیں چھوڑ دو۔ اب ایسے ہی چلنا ہوگا''...... میری ماں نے بالکل بے بس اور مجبور ہوکر دوبارہ اپنے ہرے بھرے گھر کی طرف دیکھا۔ دن رات کی ایک ایک لمحے کی محنت سے انہوں نے یہ گھر سجایا تھا۔ اس گھر میں ان کی پوجا کا کمرہ تھا۔ ان کا خوبصورت کچن تھا۔ اس گھر میں وہ کمرہ تھا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ اس گھر میں ان کے صوفے تھے پلنگ تھے الماریاں تھیں آئینے تھے پردے تھے ٹیبل لیمپ تھے۔'' ۱۰

ان سبھی حالات و واقعات کو کرشن چندر نے ہو بہو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے اور ڈوگرہ شاہی خاندان و مہاراجہ پونچھ کے مظالم کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کے بعد جب تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ کشمیر بھی تقسیم ہو جاتا ہے تو کس طرح یہاں کے لوگ گھناؤنے حالات کا شکار ہوتے ہیں اور تقسیم کا کرب جو آج تک لوگوں کے دلوں میں تر و تازہ ہے، اس حادثے کو اور اس تقسیم سے کشمیر کے اندر پیدا شدہ فساد اور مسائل و مصائب کو بھی کرشن چندر نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں شاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔

کرشن چندر نے کشمیر کی سیاسی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب کا بھی گہرا مشاہدہ کیا ہے اور اس تہذیب و ثقافت کو بھی اپنی تخلیقات میں خاص جگہ دی ہے۔ کشمیر کی دو بڑی تہذیبیں ہیں جن میں ایک ریاست پونچھ کی تہذیب ہے اور دوسری وادی یعنی سری نگر کی تہذیب ہے۔ ان دونوں تہذیبوں کو انہوں نے اپنی تخلیقات میں شاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے وادی کی تہذیب پر بھی

کم توجہ دی ہے۔ انہوں نے سب سے زیادہ خطہ پیر پنجال یعنی ریاست پونچھ کی تہذیبی عکاسی کی ہے۔ خطہ پیر پنجال کی تہذیب کا ایک اہم حصّہ وہ گجر اور بکروال لوگ ہیں جو چھے مہینے اپنے گھروں میں یا نیچے میدانی علاقوں میں گزارتے ہیں اور چھے مہینے پیر پنجال کے اونچے برف پوش پہاڑوں اور جنگلوں میں کھلے آسمان تلے اور فطری فضا میں اپنی بھیڑ بکریوں اور مال مویشی کے ساتھ گزارتے ہیں۔ کرشن چندر نے اپنی کئی تخلیقات میں پہاڑوں میں رہنے والے اس گجر بکروال طبقے کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس طبقے کی زندگی، طرز زندگی، رہن سہن، رسم وروایات اور اس قدیم طرز حیات کو شاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ یہاں ان ہی پہاڑوں میں بسنے والے ایک شخص کی تصویر کچھ اس طرح ہے جسے ان پہاڑوں میں ریفریجریٹر کی سہولت میسّر نہیں اور وہ شخص ریفریجریٹر کی جگہ دودھ کیسے ٹھنڈا رکھتا ہے بقول کرشن چندر :

> ''زمین کھودتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس جگہ سے مٹی میں دبی ہوئی مٹی کی ایک ہانڈی برآمد کی جو لبالب ٹھنڈے میٹھے دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ 'یہاں کی زمین اتنی ٹھنڈی ہے کہ کئی کئی دن پرانا دودھ اس مٹی میں دبا رہتا ہے اور خراب نہیں ہوتا' شرفو ہمیں سمجھانے لگا۔'' [11]

خطہ پیر پنجال کے پہاڑوں یا برفانی علاقوں میں ریفریجریٹر کا کام یہاں کی مٹی سے لیا جاتا ہے کیونکہ یہاں کی مٹی بھی اس قدر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ بہر حال یہ محض اس علاقے میں بسنے والے ایک خاص طبقے کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔ سچ یہ ہے کہ کرشن چندر نے اس خطے کی مکمل تہذیب کو بڑی باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے کیونکہ یہ تہذیب ان کی رگوں میں خون کی طرح بسی ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ خطہ کشمیر میں ایک وہ کلچر بھی ہے جس کو نہ ہی ہم تہذیب کہہ سکتے

ہیں اور نہ ہی یہ کلچر اس خوبصورت خطے کا یا یہاں کے خاندانوں کا تیار کردہ ہے۔ یہ کلچر ہمیں سیاحتی مقامات اور سیاحتی اڈوں پر ملتا ہے جسے باہر سے آنے والے سیاحوں نے تیار کیا ہے۔ یہاں عیاری ومکاری، ہوس پرستی، زر پرستی، جسم فروشی، مارا ماری اور آج کی ترقی یافتہ دنیا کی سبھی خصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن یہ کلچر یہاں کے خاندانوں یا نسلوں کی وراثت نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف سیاح لوگوں کی دین ہے۔ کرشن چندر نے اس کلچر کو بھی ہو بہو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔

کشمیر اپنی جغرافیائی اور فطری خصوصیات کی وجہ سے ہی کشمیر ہے یعنی جغرافیائی خدوخال ہی کی وجہ سے کشمیر دیگر جگہوں یا دنیا کے دیگر علاقوں سے مختلف ومنفرد بھی ہے اور مشہور بھی ہے۔ کرشن چندر نے اس جنت نظیر سرزمین کی ان تمامی جغرافیائی خصوصیات کو بھی شاندار طریقے سے پیش کیا ہے جو صرف اس خطے کو قدرت کی دین ہیں اور جن کی بنیاد پر اس سرزمین کو ارضی جنت یا جنت نظیر کہا جاتا ہے۔ پیر پنجال کے اونچے اور خطرناک پہاڑ ہوں یا وادی کے حسین مناظر، پونچھ سے بہنے والے دریائے سورن اور دریائے بتاڑ ہوں یا وادی کشمیر کو سیراب کرتا ہوا دریائے جہلم، اونچے اونچے برف پوش خوبصورت پہاڑ ہوں یا گہرے صاف وشفاف پانی کے نالے ہوں، گلمرگ، سونا مرگ اور پہلگام جیسے سیاحتی مقام ہوں یا جھیل ڈل اور جھیل وُلر کے حسین اور دلکش نظارے ہوں، اس علاقے کے تاریخی مقامات ہوں یا یہاں کی تاریخی عمارات ہوں، الغرض انہوں نے یہاں کی تمامی جغرافیائی خصوصیات کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے اور کشمیر جنت نظیر سرزمین کی شاندار عکاسی کی ہے۔ کسی بھی غیر کشمیری نے آج تک خطہ کشمیر کو اتنے عمدہ طریقے سے پیش نہیں کیا جس طرح کرشن چندر نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے یہاں کی خوبصورتی اور بدصورتی دونوں کو گلے لگایا ہے نیز اس جنت نشاں سرزمین یا ارضی جنت کے دلفریب اور فردوس نظیر نظاروں کے ساتھ ساتھ یہاں کے جہنم زار مسائل ومصائب کو بھی ہو بہو پیش کیا ہے۔

تقسیم اور فساد

ہندوستان اور ہندوستانی قوم کو ایک لمبی جدوجہد کے بعد جب آزادی نصیب ہوئی تو اس آزادی نے لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانیوں کی جانیں لے لیں اور تقسیم وہجر وہجرت کا وہ کرب دیا جو آج تک ہندوستانیوں کے دلوں اور دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ کرشن چندر نے ہندوستان کی آزادی، تقسیم ہند اور اس کے ساتھ ساتھ تقسیم کشمیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور بہت زیادہ متاثر و مایوس بھی ہوئے ہیں۔ اس تقسیم اور مذہبی فساد نیز انسان اور انسانیت کے قتلِ عام اور انسانی بے حرمتی کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس درد وکرب اور بے بسی کو محسوس کیا ہے نیز مختلف فنی طریقوں سے اور اس صورت حال کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے اور اس انسانیت شکن صورت حال کی تصویریں اپنی تخلیقات میں محفوظ کر دی ہیں تا کہ آنے والی نسلیں اس صورت حال سے بخوبی واقف ہوسکیں اور آئندہ ایسی کسی حماقت کی جرات نہ کریں۔ انہوں نے تقسیم اور فساد کو اپنے ناولوں میں بھی جگہ دی ہے اور افسانوں میں بھی ان مصائب ومسائل کو پیش کیا ہے، یہاں تک کہ ان کے سفرنامے ''ورق ورق کھوگئی زندگی میری'' میں بھی تقسیم سے پیدا شدہ حالات ومسائل اور ان کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ کرشن چندر نے اپنے ناول ''مٹی کے صنم'' میں تقسیم کشمیر اور ریاست پونچھ کی تقسیم نیز یہاں کے انسانوں کے کرب کو بیان کیا ہے۔ ناول ''طوفان کی کلیاں'' میں تقسیم کے وقت کشمیر میں ڈوگرہ خاندان کے پیدا کردہ مذہبی فسادات کی شاندار عکاسی ملتی ہے۔ ان کے ناول 'غدار' میں پنجاب اور دریائے راوی کے آر پار کے علاقوں میں ہونے والے فساد اور قتلِ عام کا ہو بہو بیان ہوا ہے۔ اسی طرح ان کے افسانے ''میری وادی ویران ہوگئی'' میں مہنڈر میں ہونے والے فساد اور تباہی وبربادی کا بیان ملتا ہے۔ ''دلی کے دائرے'' میں تقسیم کے بعد دلی شہر کے حالات اور افراتفری کو بیان کیا ہے۔ ''بہار کے

بعد'' افسانے میں تقسیم کشمیر اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو بیان کیا ہے۔ ''امرتسر آزادی کے بعد'' میں تقسیم کے وقت پنجاب کے شہر امرتسر میں ہونے والے فسادات اور قتلِ عام کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ ''اندھے'' میں لاہور شہر میں ہونے والے مذہبی فساد اور تباہی و بربادی کا بیان ہوا ہے۔ ''لال باغ'' میں بمبئی میں ہونے والے مذہبی فساد کا بیان ہوا ہے۔ ''ایک طوائف کا خط'' میں ایک الگ انداز سے آئینہ دکھایا گیا ہے۔ یہ خط ایک طوائف پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح کے نام لکھتی ہے۔ اس طوائف کے پاس دو لڑکیاں ہیں جن میں ایک ہندو اور ایک مسلمان ہے۔ یہ طوائف اس خط کے ذریعے نہرو اور جناح سے ان لڑکیوں کے تحفظ کی مانگ کرتی ہے۔ ان دونوں لڑکیوں کے خاندان اسی فساد کی نظر ہو جاتے ہیں اور ان دونوں کو ایک طوائف سہارا دیتی ہے۔ ''جیکسن'' افسانے میں جیکسن نامی ایک انگریز افسر ہے جو ہندو مسلم دونوں کو اس فساد کے لیے ہتھیار فراہم کرتا ہے اور اس فساد کو فروغ دیتا ہے۔ ''پشاور ایکسپریس'' میں مذہبی فساد، انسانیت کے قتلِ عام اور انسانیت کی بے حرمتی کی داستان ایک ریل کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ ''جرا اور جری'' میں تقسیم ہند اور تقسیم کشمیر کے ساتھ ساتھ محبت کی تقسیم، انسانوں اور انسانیت کی تقسیم، خاندان، تہذیب اور احساسات کی تقسیم کو دکھایا گیا ہے۔ ''آدھے گھنٹے کا خدا'' میں ایک آدمی ایسی لڑکی کا بھی قتل کر دیتا ہے جس سے اس نے محبت کی تھی کیونکہ تقسیم کی وجہ سے محبت پر نفرت کا جذبہ حاوی ہو جاتا ہے۔ ''تائی ایسری'' میں بھی تقسیم اور فساد کے اثرات صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح کرشن چندر نے تقسیم اور فساد کو نیز اس تقسیم سے پیدا شدہ حالات و مسائل کو اپنی تخلیقات میں مختلف فنی ٹکنیکوں کی مدد سے اور مختلف مکانی صورت حال کے ساتھ نہایت ہی باریکی سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے تقسیم اور فساد کو نیز اس تقسیم کے تمامی نشیب و فراز کو اپنی تخلیقات میں محفوظ کر دیا ہے۔

عورت کی پیشکش

کرشن چندر سے پہلے بھی فنکاروں نے عورت کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔لیکن ہر کسی نے عورت کے کسی ایک پہلو کو ہی پیش کیا ہے۔ کرشن چندر نے عورت کو تمامی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ،اس ذات کے تمامی مثبت و منفی پہلوؤں کو نیز عورت کے مختلف اور رنگا رنگ احساسات و جذبات کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ کرشن چندر کو انسانی نفسیات پر کافی عبور حاصل ہے جس کا انہوں نے اپنی تخلیقات میں اکثر جگہوں پر ثبوت دیا ہے۔عورت کی نفسیات کو بھی انہوں نے اپنے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں میں بڑے فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں ہمیں عورت صرف کسی ایک پیشے سے منسلک ہی نظر نہیں آتی بلکہ انہوں نے عورت کے سبھی روپ دیکھے ہیں اور ہمیں دکھائے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں عورت محبت و مروت اور ایثار و خود سپردگی کا پیکر بھی ہے اور ہمت و غیرت،عزم و عظمت اور ہمدردی کا اہم ستون بھی ہے۔ان کی تخلیقات میں پیش کردہ عورت بے کسی و بے بسی اور غریبی و مفلسی سے عبارت بھی ہے اور ان کی کہانیوں میں پیش کردہ عورت عیاری و مکاری اور لالچ و خود غرضی کی شاندار مثال بھی ہے۔ ان کی تخلیقات میں پیش کردہ نسائی کردار رونق گھر بھی ہیں اور رونق محفل یا رونق بازار بھی ہیں۔ اس طرح کرشن چندر نے عورت کے ہر پہلو کو اور ہر شکل کو یہاں پیش کیا ہے۔ انسان کی حقیقی زندگی اس قدر رنگارنگ ہوتی ہے کہ انسان اچھائیوں و برائیوں اور خوبیوں و خامیوں کا آمیزہ ہے۔ اسی طرح ایک عورت اگر محبت و مروت اور ایثار و ممتا کا پیکر ہے تو اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ عورت کے اندر عیاری و مکاری اور خود غرضی و بے وفائی نہیں ہو سکتی۔ کرشن چندر نے بھی عورت کے ہر پہلو اور ہر معیار کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتے ہوئے ہمارے سماج کی عورت کے اصل کردار کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر ہم عورت کی محبت و مروت اور شفقت و ایثار کی بات کریں تو ہمارے سامنے سب سے اہم

کرداران کے سوانحی ناولوں میں 'ماں جی' کا ہے جو اپنے بچوں کے لیے بہت فکر مند رہتی ہیں اوران کی سلامتی کے لیے ہر قدم اٹھانے کو تیار ہیں۔ناول ''باون پتّے'' کی 'رفیعہ' بھی ایثار و محبت کی شاندار مثال ہے جو اپنی ذات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کسی دوسرے کے لیے اپنا وقت بھی ضائع کرتی ہے اور اپنا روپیہ بھی ضائع کرتی ہے۔ناول ''شکست'' کی 'چندرا' اور 'ونتی' بھی ایثار و محبت اور مروت و ہمدردی میں کسی سے کم نہیں۔ بے شک یہ دونوں اپنی اپنی محبت میں ناکام ہو جاتی ہیں لیکن یہ اپنی محبت و مروت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتیں۔اسی طرح ان کے ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' کا مرکزی نسائی کردار 'لاچی' بھی محبت و وفاداری میں اپنی مثال آپ ہے جو اپنی محبت کی خاطر قتل بھی کر سکتی ہے اور اپنی آنکھوں کی بینائی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے لیکن اپنے پاکیزہ دامن کو داغ دار نہیں ہونے دیتی۔ اگر کرشن چندر کی افسانہ نگاری کے حوالے سے بات کریں توان کے افسانوں کے کردار آنگی، بگی، گوماں (گومتی)، اور نیرا، وہ کردار یا وہ نوجوان خوبصورت لڑکیاں ہیں جو بہت جلد ہی اجنبیوں کو دل دے بیٹھتی ہیں اور اپنے آپ کو اپنے عاشقوں کے سپرد کرنے کے خواب دیکھتی ہیں۔ ان کی محبت معصوم اور پاکیزہ ہے جو زمانے کی عیاری و مکاری کو سمجھنے سے عاری ہے۔ اسی طرح ان کے افسانے ''شمع کے سامنے'' کی 'شمع' بھی محبت و مروت کا پیکر ہے۔ اس محبت اور ایثار کی انتہا ہمیں ان کے افسانے ''بندوالی'' میں دکھائی دیتی ہے جہاں مرکزی کردار 'فیریزی' اپنے عاشق کی بے وفائی پر خودکشی کر لیتی ہے۔اسی طرح اگر ہم عورت کی ہمت، غیرت اور تقدس و پاکیزگی کی بات کریں توان کے 'ماں جی' کے کردار کے بعد سب سے شاندار اور مثالی کردار ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' کی 'لاچی' کا ہے جو ایک خانہ بدوش لڑکی ہے۔اس کے پاس کچھ بھی نہیں صرف حسن ہے اوراس کے حسن کے پرستار و خریدار ہر قدم پر کھڑے ہیں لیکن لاچی جیل جانا پسند کر لیتی ہے اور اپنی آنکھوں کی بینائی سے ہاتھ دھونا بھی گوارا کر لیتی ہے لیکن

اپنے آنچل کو آلودہ نہیں ہونے دیتی۔ ''شکست'' کی 'چندرا' بھی ہمت وغیرت اور عزت نفس کی شاندار مثال ہے۔ لیکن یہاں سب سے مضبوط اور ہمت وغیرت کی عمدہ مثال ناول ''آدھا راستہ'' کی گنگا ہے جو گنگارام نامی لڑکا بن کر سیاحوں اور صاحبوں کی پالکی اٹھاتی ہے اور اپنے گھر کا نظام چلاتی ہے۔ ایک ایسا ہی پرہمت اور پر عزم نسائی کردار ان کے افسانے ''گرجن کی ایک شام'' کی 'ذی شی' بھی ہے جو خطہ پیر پنجال کے مشکل پہاڑی راستوں سے ایک زخمی انسان کو اپنے کندھے پر اٹھا کر دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد اسے منزل تک پہونچاتی ہے۔ ان کا ایک اور نسائی کردار 'زینی' بھی محبت اور غیرت کا پیکر ہے جو عزت نفس کی حفاظت کرنا بھی جانتی ہے اور اس کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اسی طرح اگر ہم کرشن چندر کے نسائی کرداروں کے کسی دیگر پہلو کو دیکھنا چاہیں تو ان کے وہ نسائی کردار بھی قابلِ توجہ ہیں جو سیاسی یا سماجی خستہ حالی کی وجہ سے مجبور اور بے بس ہیں۔ ایسے کرداروں میں ان کے ناولوں کے نسائی کردار 'کوشلیا' اور 'گنگا بائی' کے نام لیے جاسکتے ہیں جو سماج کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہو کر جرم کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی ناول نگاری میں ایک اہم نسائی کردار 'بلبل' کا بھی ہے جو فلمی دنیا میں جا کر لاکھوں روپیہ کماتی ہے لیکن آخر کار فلمی دنیا کی عیاری ومکاری، لالچ، زر پرستی اور ہوس پرستی سے بے بس ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں اسے صرف پیسہ ملتا ہے۔ تقدس اور پاکیزگی، انسانیت، محبت، ہمدردی اور احساس یہاں اس کے مقدر میں نہیں ہے۔ ان کے ناول ''پانچ لوفر'' کی طوائف 'جمنا' بھی ایک بے بس اور مجبور نسائی کردار ہے جسے طوائف بننے کے بعد بھی دو وقت کا کھانا میسّر نہیں ہوتا۔ ناول ''برف کے پھول'' کی 'زینب' بھی ایک بے بس اور مظلوم کردار ہے جو سماج کے مظالم کی تاب نہ لا کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور اسی نہج کا ایک نسائی کردار پونچھ کی رہنے والی خوبصورت لڑکی 'وسندھرا' بھی ہے جسے کرشن چندر پونچھ کی قلوپطرہ کہتے ہیں۔ یہ خوبصورت لڑکی بھی سیاسی

بدحالی کی تاب نہ لاکر ہجرت پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ناولوں کے ساتھ ہی کرشن چندر کے افسانوں میں بھی ہمیں بہت سے مجبور اور بے بس نسائی کردار ملتے ہیں۔ افسانے ''جہلم میں ناؤ پر'' کی 'شاما' بھی کسی وجہ سے بے بس و پریشان ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسوں آجاتے ہیں لیکن یہ اپنی بے بسی کا اظہار نہیں کرتی۔ افسانے ''جنت اور جہنم'' کی 'زینی' اور ''ویکسی نیٹر'' کی 'ریشماں' بھی وہ نسائی کردار ہیں جو حالات سے لڑتے لڑتے تھک کر بے بس ہو جاتے ہیں اور مجبوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کے رپورتاژ ''لاہور سے بہرام گلہ تک'' میں شامل نسائی کردار 'نور جہان' بھی لاچار و مجبور اور بے بس ہے۔ اس کے والدین تو جہانگیر باشاہ کی ملکہ نور جہان کے نام پر اس کا نام رکھتے ہیں لیکن محض شاہانہ نام رکھنے سے انسان کے حالات درست نہیں ہو جاتے۔ یہ عورت بے شک نور جہان ہے لیکن غربت و مفلسی میں اس قدر بے بس ہے کہ ایک ایک پیسے کے لیے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی تخلیقات میں جگہ جگہ بے بس نسائی کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی طرح کرشن چندر کی تخلیقات میں ہمیں ایسے نسائی کردار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو عیاری و مکاری اور خود غرضی و مطلب پرستی سے عبارت ہیں۔ اس حوالے سے ناول ''آئینے اکیلے ہیں'' کی 'جولی' ہو جو اپنے خاوند کنول سے عیاری و مکاری سے کام لیتی ہے یا ناول ''زرگاؤں کی رانی'' کی 'مہارانی صاحبہ' ہو جو اپنی بہن اور اس کے عاشق دونوں کو عشق کی آگ میں جل کر موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے یا پھر ''ایک گدھے کی سرگزشت'' کی 'مس روپ وتی' ہو جو لاکھوں کی لالچ میں آ کر گدھے سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتی ہے یا پھر ناول ''ایک وائلن سمندر کے کنارے'' کی 'رمبھا' ہو جو اپنے عاشق سے عیاری و مکاری اور دھوکے بازی کو عقل مندی سمجھتی ہے اور آج کی تیز رفتار و زر پرست دنیا کے ساتھ دوڑ لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ سبھی نسائی کردار عیاری و مکاری اور خود غرضی و زر پرستی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس طرح کرشن چندر نے عورت

کی مختلف خصوصیات وخصائل کو، عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اور سماج میں موجود عورت کے ہر قسم کے کردار کو نیز معاشرے کی عورت کو تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنی تخلیقات میں پیش کر کے عورت کی رنگا رنگ شخصیت اور کردار کو اپنے حقیقی روپ میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

شہری ودیہاتی زندگی کا تقابل

کرشن چندر کی زندگی کا ایک بڑا اور خاص حصہ دیہاتوں میں گزرا ہے اور وہ بھی خطہ کشمیر کے خوبصورت وجنت نظیر دیہاتوں میں جہاں کی سادگی وشرافت اور آب وہوا نیز فطری فضا اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ لاہور، دلّی اور بمبئی جیسے بڑے شہروں میں بھی گزرا ہے جہاں قدم قدم پر انسان گناؤنے شہری مسائل سے نبرد آزما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر شہری زندگی اور دیہاتی زندگی دونوں کے نشیب وفراز اور مثبت ومنفی پہلوؤں سے بخوبی واقف تھے۔ کرشن چندر نے دیہاتی زندگی اور طرز زندگی کو نیز اس زندگی کی معصومیت کو اور دیہاتوں میں پائی جانے والی مثبت و قابل بقا اقدار کو بڑے قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ یہاں تک کہ خطہ پیر پنجال کے پہاڑوں میں کھلے آسمان تلے زندگی بسر کرنے والے پہاڑی قبائلی طبقوں کو نیز ان کی زندگی وطرز زندگی کو بھی انہوں نے قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ دوسری طرف بمبئی جیسے کاروباری شہر کی افراتفری، گہما گہمی، لالچ، ہوس، بھوک، عیاری ومکاری اور نفس پرستی کا بھی انہیں بخوبی اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہری ودیہاتی زندگی کو نیز ان کی تمامی خوبیوں وخامیوں کو کرشن چندر نے اپنی تخلیقات میں بخوبی پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کئی تخلیقات میں شہری ودیہاتی زندگی کا بہترین تقابل بھی کیا ہے اور شہری زندگی سے نفرت نیز دیہاتی زندگی سے خاص لگاؤ کا بھی ان کی تخلیقات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آج کا انسان شہروں سے اس قدر تنگ آچکا ہے کہ شہر میں اس کا دم گھٹ رہا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ

اگر اسے کسی پہاڑی علاقے کی فطری وتر وتازہ فضا میں سانس لینے کے لیے چند لمحے میسّر آجائیں تو وہ کسی نعمت سے کم نہیں لیکن اس کے باوجود بھی آج کا انسان شہروں کی طرف دوڑ رہا ہے۔ شہروں کی آلودہ فضا سے اور شہری زندگی کے دیگر مسائل سے آج کا انسان تنگ بھی ہے لیکن اس کے باوجود بھی انسان جدید سہولیات کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ شہر کو چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ یہ آج کے انسان کا بہت بڑا المیہ ہے۔ کرشن چندر نے اس المیے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ کرشن چندر کے ساتھ خود بھی یہ المیہ تھا کہ وہ ساری زندگی کشمیر کے کسی دیہات میں اور فطری فضا میں رہنے کی خواہش رکھتے تھے لیکن زندگی کی مشکلات اور آلام روزگار نے انہیں بمبئی جیسے شہر میں ہی رہنے پر مجبور رکھا۔ آج کے اس انسانی المیے کو کرشن چندر کی کئی تخلیقات میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے لیے کرشن چندر کے افسانے ''گرجن کی ایک شام'' سے مختصر سا اقتباس پیش خدمت ہے :

> ''اب تو دنیا تلخ حقیقتوں سے بھرے جا رہی ہے۔ نقلی دودھ اور نقلی محبت اور نقلی انسانیت، اور پھر زندگی کارخانے سے گھر کے گندے صحن میں اور گندے صحن سے کارخانے کے گندے ورکشاپ تک محدود رہتی ہے۔ اس زندگی میں بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ لیکن گرجن میں ابھی تک ہر بوڑھا اور نوجوان بچپن کی معصومیت لیے ہوئے ہے'' ۱۲

یہاں کرشن چندر نے چند شہری مسائل کا پیر پنجال کے پہاڑوں میں موجود گرجن ڈھوک کی سادہ اور فطری زندگی سے تقابل کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ تو محض ایک مثال تھی، حقیقت یہ ہے کہ ان کی کئی تخلیقات میں ہمیں شہری مسائل اور شہری و دیہاتی زندگی کا تقابل دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس حوالے سے اگر ان کے ناولوں کی بات کی

جائے تو ان کے ناول اس کا بدن میرا چمن، سپنوں کی وادی، محبت بھی قیامت بھی، چاندی کا گھاؤ، سونے کا سنسار، آئینے اکیلے ہیں، اور پیار ایک خوشبو ہے، وغیرہ خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح ان کے افسانوں آنگی، آنسوؤں والی، شمع کے سامنے، گرجن کی ایک شام، بالکونی، مہالکشمی کا پل، کشمیر کو سلام، خمیازہ، ایک وحشی ممبئی میں، زندگی کے موڑ پر، اور سیکنڈ ہینڈ کار، وغیرہ میں بھی شہری مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دیہاتی وشہری زندگی کا بہترین تقابل کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ کرشن چندر نے ایک طرف تو اپنی تخلیقات میں آج کے شہری مسائل کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے تو ساتھ ہی ان کی کئی تخلیقات میں شہروں اور دیہاتوں کا نیز شہری و دیہاتی زندگی و طرز زندگی کا بہترین تقابل بھی ملتا ہے۔

طنز ومزاح

کرشن چندر کے مزاج میں طنز ومزاح بدرجہ اتم شامل ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں مزاح کم اور طنز زیادہ پایا جاتا ہے۔ یوں تو طنز ان کی ہر تخلیق یا اکثر تخلیقات میں موجود ہوتا ہے اور ہمارے سماج کی خامیوں کو کرشن چندر جگہ جگہ طنز کا نشانہ بناتے ہیں لیکن چند تخلیقات ایسی ہیں جو طنز ومزاح سے بھرپور ہیں اور یہ تخلیقات ان کے عظیم طنزیہ شاہکار کہلانے کی مستحق ہیں۔ ایسی تخلیقات میں ان کے ناولوں ایک گدھے کی سرگزشت، گدھے کی واپسی، ایک گدھا نیفا میں، فلمی قاعدہ، اُلٹا درخت، اور دادر پُل کے بچے، وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح افسانوں میں پرانے خدا، پرماتما، بھگوان کی آمد، کوپن، یوگا، ردی، وٹامن، عورتوں کا عطر، گڑھا، پشاور ایکسپریس، اور آنکھیں، وغیرہ ان کے بے مثال طنزیہ افسانے ہیں۔ طنز کے ساتھ ساتھ کرشن چندر اپنی تخلیقات میں مزاح بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی کئی تخلیقات مزاح نگاری کی بھی شاندار مثالیں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی طنزیہ ومزاحیہ تخلیقات میں مزاح کم اور طنز زیادہ پایا جاتا

ہے بلکہ طنز اپنی انتہا کو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی چند طنز یہ تخلیقات کا متبادل آج بھی اردو ادب میں نایاب ہے۔ کرشن چندر کے افسانوی ادب میں پائے جانے والے طنز و مزاح کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے شکیب نیازی لکھتے ہیں :

"اگر کرشن چندر کے افسانوی ادب کا جائزہ لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ کرشن چندر نے اردو طنز ومزاح کے سرمایہ میں جو بے پناہ اضافہ کیا ہے اس کی مثال ان کے معاصرین میں بھی نہیں ملتی" ۱۳؎

کرشن چندر کے طنز کا شکار کوئی ایک طبقہ، کوئی ایک فرد یا سماج کا کوئی ایک پہلو نہیں ہوتا بلکہ سماج کا ہر پہلوان کی نظر میں ہوتا ہے اور یہ اپنے طنز سے اپنے سماج کو کرید کر سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خصوصی طور پر سماج کے دو پہلو یعنی مذہب اور سیاست ان کے طنز کا جگہ جگہ نشانہ بنتے ہیں کیونکہ آج تک ہمارے سماج میں کوئی بھی بڑا حادثہ ہوتا ہے یا ہمارا سماج کسی مشکل یا مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو اس میں ضرور کہیں نہ کہیں مذہبی اور سیاسی ٹھیکے داروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کرشن چندر ان دونوں طبقوں کے کارناموں سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے انہوں نے ان دونوں طبقوں کو جگہ جگہ اپنے طنزیہ تیروں کا نشانہ بنا کر ان کے کارناموں کو عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب کرشن چندر طنز میں اپنی انتہا کو پہونچتے ہیں تو انسانوں کے ساتھ ساتھ بھگوان اور خدا پر بھی اپنے طنزیہ تیروں سے وار کردیتے ہیں جس کی بہترین مثالیں ان کی تخلیقات دادر پُل کے بچے، پرانے خدا، پرماتما، اور بھگوان کی آمد، وغیرہ ہیں۔ کرشن چندر نے سماج کے ہر پہلو اور ہر مسئلے کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے طنز کا انداز یہ ہے کہ نہایت ہی شیریں زبان میں اس طرح کے نشتر چبھوتے ہیں کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا اور جب غور کرو تب پتہ چلتا ہے کہ ان کا نشانہ کہاں لگا ہے۔ کرشن چندر کے طنز سے یا ان کی طنزیہ تخلیقات سے متاثر ہو کر پروفیسر قمر رئیس بھی ان کی شاہکار تخلیقات کا اور ان تخلیقات کی

عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔اس حوالے سے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں :

"اُردو نثر میں سماجی اور سیاسی طنز کے شاہکار اگر کہیں ملتے ہیں تو کرشن چندر کی تحریروں میں۔ اس میدان میں کوئی دوسرا ان کا حریف ومقابل نہیں" ۱۴؎

کرشن چندر کی طنزیہ تخلیقات اور طنز ومزاح کی دنیا میں ان کی خدمات قابلِ داد اور قابلِ قدر ہونے کے ساتھ ساتھ لافانی ولاثانی بھی ہیں۔ان کے طنز ومزاح کی عمدہ مثالیں ہمیں ان کے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں میں ملتی ہیں۔اگر ہم ناولوں کے حوالے سے بات کریں تو ایک گدھے کی سرگزشت، گدھے کی واپسی، ایک گدھا نیفا میں، فلمی قاعدہ، دادر پُل کے بچے، باون پتے، کاغذ کی ناؤ، الٹا درخت، ستاروں کی سیر، اور مشینوں کا شہر، وغیرہ نامی ناول ان کے طنز ومزاح کے شاندار نمونے ہیں۔اسی طرح افسانوں میں کوپن، دیباچہ نگاری، یوگا، ردی، بے بال وپر، اخبار جوتشی، چلتا پرزہ، غلط فہمی، گانا، جان پہچان، مینڈک کی گرفتاری، بھگوان کی آمد، پرماتما، دلیپ کمار کا نائی، بے وقوفی، وٹامن، گھونگھٹ میں گوری جلے، براڈ کاسٹنگ کی بیہودگیاں، صحت خراب ہے، ماہر نفسیات، پہلا دن، جگر گوشے، کھانسی، لوکی، عورتوں کا عطر، گڑھا، وہی جگہ، غسلیات، پشاور ایکسپریس، پرانے خدا، چڑیا کا غلام، بدصورتی، رونا، بیچلر آف آرٹس، شادی، الف لیلیٰ کی گیارہویں رات، آنکھیں، کسان اور دیوتا، ہوائی قلعے، عوامی ڈے، اور کل ہند ہیروئن کانفرنس، وغیرہ ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں انہوں نے طنزیہ ومزاحیہ انداز میں سماج کے مختلف مسائل کو پیش کیا ہے۔اسی طرح انہوں نے حجامت، رشتے کی ضرورت، کتّے کی موت، ایک روپیہ ایک پھول، اور کتاب کا کفن، نامی ڈراموں میں بھی طنزیہ ومزاحیہ انداز بیان کو اپنایا ہے۔ اس طرح کرشن چندر نے افسانوی ادب میں طنزیہ و مزاحیہ انداز بیان کو اپنا کر سماجی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اردو طنز ومزاح کو لاثانی

ولافانی نمونے دیے ہیں۔ اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب کی تاریخ میں کرشن چندر ایک ناقابلِ فراموش ہی نہیں بلکہ سرِ فہرست لکھا جانے والا نام ہے۔

گہرا مشاہدہ، آفاقی نظر اور دور اندیشی

کرشن چندر نے دنیا کی ہر چیز کو بڑی گہری اور تنقیدی نظر سے دیکھا ہے۔ اس دنیا کی کسی چھوٹی یا غیر ضروری چیز کو بھی کرشن چندر نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اسے ہر پہلو سے جانچتے پرکھتے ہیں اور اس کی حقیقت تک پہونچتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسی چیزوں کے بارے میں کرشن چندر نہیں بھی جانتے ہوں گے جنہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ اس طرح انہوں نے اس مادی دنیا کو دلچسپی سے دیکھا ہے اور اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہی مشاہدہ کرشن چندر کے تخلیقی سفر میں ان کا مددگار رہتا ہے جس کی وجہ سے یہ ہر چیز یا سماج کے ہر پہلو کو اور سماجی حقائق کو اصل روپ میں پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کرشن چندر جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اور سماج کے جس پہلو کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں اس کے تمامی نشیب وفراز کو اور تمامی حالات وواقعات کو نہایت ہی شاندار طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ ان کے گہرے مشاہدے کا ہی کمال ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی نظر بہت تیز اور بلند ہے۔ یہاں ہم انہیں علامہ اقبال کا شاہین کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ کرشن چندر مقامی اور قومی مسائل کو اپنی نظروں کا مرکز بنانے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مسائل ومعاملات پر بھی کڑی نظر رکھتے ہیں۔ کشمیر کی جنت نظیر رومانی فضا اور جہنم زار سیاسی حالات بھی کرشن چندر کی نظروں کا مرکز بنتے ہیں نیز تلنگانہ کے مظلوم کسان اور قحط بنگال سے متاثر ہونے والے نیز بھوک وپیاس سے مرنے والے بنگالی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ ان کی نظر ممبئی کی فلمی اور تیز رفتار دنیا پر بھی ہے نیز خطہ کشمیر کے پہاڑوں پر رہنے والے اس قبائلی طبقے کو بھی یہ اپنی نظروں میں رکھتے ہیں جن کی زندگی آج بھی قدیم طرز پر اور کھلی فضا میں آسمان تلے

گزرتی ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔عالمی جنگوں سے ہونے والے نقصانات ہوں یا ان جنگوں سے پیدا شدہ مسائل ہوں، جدید سائنسی ترقی ہو یا عالمی سطح پر ہتھیار حاصل کرنے کی دوڑ ہو جسے ہم سرد جنگ کے نام سے جانتے ہیں، انسان کا چاند پر جانے کا مسئلہ ہو یا سائنس کی ترقی اور ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے پوری دنیا پر منڈلاتے ہوئے خطرات کے بادل ہوں، کرشن چندر ان تمامی بین الاقوامی مسائل سے بھی بخوبی واقف ہیں اور ان مسائل کو کامیابی کے ساتھ اپنی کہانیوں میں پیش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ کرشن چندر کی دوراندیشی کا اندازہ بھی ان کی تخلیقات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔کرشن چندر سائنس اور ایٹمی ہتھیاروں کی ترقی سے مستقبل میں ہونے والی تباہیوں سے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں اور ہمیں اس بات سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں امن قائم نہ ہوسکا تو ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ انسان ختم ہوجائیں گے اور پوری دنیا پر جانوروں کی حکومت ہوگی نیز جس طرح آج جنگلی جانور انسان سے چھپ کر جنگلوں میں زندگی گزارتے ہیں اسی طرح مستقبل میں انسان چھپ کر اپنا وقت گزاریں گے۔اس طرح ہم یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کرشن چندر کا مشاہدہ گہرا، ان کی نظر تیز، بین الاقوامی اور آفاقی ہونے کے ساتھ ساتھ کرشن چندر بلا کے ذہین اور دوراندیش بھی تھے اور انہوں نے اپنے گہرے مشاہدے، بین الاقوامی و آفاقی نظر اور دوراندیشی کا ثبوت اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ دیا ہے۔

انسانی ہمدردی، امن اور نظریہ حیات

کرشن چندر پیدائشی طور پر تو ایک ہندو تھے اور بعد میں سلمیٰ صدیقی سے شادی کے وقت کلمہ پڑھ کر رسمی طور پر مسلمان بھی ہوئے لیکن اصل میں وہ سراسر اشتراکی تھے اور ان کا مذہب ہندو مسلم سے زیادہ انسانیت تھا۔بے شک ان کی ماں ایک کٹر ہندو عورت تھیں لیکن ان کے والد روایت شکن اور انسانیت و انسانی ہمدردی کے پیکر تھے۔کرشن

چندر ایک آزاد اور مثبت ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے انسانی ہمدردی، محبت ومروت اور ایثار جیسے پاکیزہ و مثبت جذبات اپنے والد سے ہی حاصل کیے تھے۔ جب انہوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت ہر طرف ادبی حلقوں میں ترقی پسند تحریک و نظریات کے چرچے عام تھے۔ کرشن چندر نے اشتراکیت کے اثرات قبول کیے اور باقاعدہ ترقی پسند تحریک کا حصہ بن گئے۔ اب ایک آزاد ذہن اور انسانیت پرست انسان نے جب ترقی پسند فلسفے کو اپنایا تو اس انسان نے اپنی زندگی انسانیت کے لیے وقف کر دی۔ اس طرح کرشن چندر نے برائے راست انسانیت سے محبت اور انسانی ہمدردی کا ثبوت اپنے قلم کے زور سے دیا ہے۔ کرشن چندر جب سماج میں کسی انسان کی بے بسی دیکھتے ہیں تو برداشت نہیں کر سکتے اور قلم اٹھا کر انسان و انسانیت کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں نیز باطل کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔ اکثر جگہوں پر کرشن چندر انسانی ہمدردی اور انسانیت پرستی کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے اور براہِ راست تقریر کرنے لگتے ہیں جو فنی اعتبار سے ان کی تخلیقات کو نقصان بھی پہونچاتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ان کے اندر انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور جہاں بھی یہ انسان کو مجبور و بے بس دیکھتے ہیں تڑپ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کرشن چندر نے اپنی تخلیقات میں عالمی امن پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کو دیکھ کر کرشن چندر بہت ڈر جاتے ہیں۔ یہ دو جنگیں اور ان عالمی جنگوں میں ہونے والی انسانیت کی اتنے بڑے پیمانے پر تباہی کرشن چندر کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر اپنی تخلیقات میں مختلف طریقوں سے عالمی جنگوں کی تباہ کاریاں پیش کرتے ہیں نیز سائنسی ترقی اور ایٹمی ہتھیاروں سے پیدا شدہ خطرات جو پوری دنیا پر منڈلا رہے ہیں سے آنے والی نسلوں کو آگاہ کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ اگر جنگوں پر قابو نہ ڈالا گیا تو اس دنیا سے

انسان ناپید ہو جائیں گے اور ایک دن ایسا بھی آئے گا جب پوری دنیا میں صرف جانور ہی آباد ہوں گے نیز جانوروں ہی کی حکومت ہوگی حتیٰ کہ اگر چند انسان برائے نام دنیا میں موجود ہوئے تو ان انسانوں پر بھی جانوروں کی حکومت ہوگی۔ اس طرح انہوں نے اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ یہ پیغام دیا ہے کہ انسان اور انسانیت کی بقا کا واحد راستہ امن کا راستہ ہے۔

اگر ہم نظریہ حیات کے حوالے سے بات کریں تو یہ حقیقت ہے کہ کرشن چندر کا نظریہ حیات سراسر مارکسی ہے کیوں کہ کرشن چندر مکمل طور پر اشتراکی تھے اور اپنے آپ کو اشتراکی کہلاتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ یہی اشتراکیت ان کا مذہب و مسلک تھی اور یہی اشتراکیت ان کا نظریہ حیات تھا۔ کرشن چندر نے اور دیگر اشتراکی یا مارکسی ادیبوں نے آزادی کے بعد ہندوستان میں اشتراکی یا مارکسی طرز حکومت کا خواب دیکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جس طرح انسان کا ہر خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا اسی طرح ان کا یہ خواب بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔ کرشن چندر دنیا کے ہر انسان کو انسان ماننے پر اور سبھی کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے انسان کی سماجی، سیاسی اور معاشی برابری کا خواب دیکھا تھا جس کا اظہار ان کی اکثر تخلیقات سے ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسانیت پرستی اور سماجی و معاشی برابری ہی ان کا نظریہ حیات تھا جس کا اظہار جگہ جگہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں شعوری یا لاشعوری طور پر کیا ہے۔

اسلوب اور زبان و بیان

کرشن چندر کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات کی ایک اہم خصوصیت ان کا اسلوب بیان ہے۔ ان کے اسلوب پر بڑے بڑے ادیب اور فنکار بھی رشک کرتے ہیں۔ یہی اسلوب بیان کرشن چندر کو دیگر ادیبوں سے مختلف اور انفرادیت کا حامل بناتا ہے نیز اپنے اسلوب ہی کی وجہ سے کرشن چندر کو ترقی پسند ادیبوں میں سب

سے زیادہ یاد کیا جاتا ہے۔ کرشن چندر ہر واقعے اور ہر چیز کو خوبصورت زبان اور اظہارِ بیان کے ساتھ اپنے فن کا حصہ بنانے میں ماہر ہیں۔ کالو بھنگی کی داستان حیات ہو یا قحط بنگال کا قصہ، کشمیر کی فطری و حسین فضا اور جنت نظیر مناظر ہوں یا تلنگانہ کے مظلوم کسان، سرحدوں پر مارے جانے والے فوجی جوان ہوں یا عالمی جنگوں سے ہونے والی انسانیت کی تباہی، ایٹمی ہتھیاروں کا معاملہ ہو یا چاند پر جانے کا مسئلہ الغرض کرشن چندر کو ہر معاملے اور سماج کے ہر پہلو کو فنکارانہ انداز میں بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ کرشن چندر کے اظہار بیان اور ان کی پُرکشش و متاثر کن زبان کا اعتراف کرتے ہوئے شکیب نیازی لکھتے ہیں :

> ''کرشن چندر کی سب سے بڑی قوت جہاں ان کا فکری نصب العین ہے وہیں دوسری جانب اظہارِ بیان پر ان کو قدرت بھی ہے۔ اظہار بیان کے جتنے بھی اسالیب اور جتنے بھی انداز ہیں کرشن چندر نے قریباً قریباً سب کو کمال خوبی سے اپنے افسانوں میں برتا ہے'' ۱۵

کرشن چندر نے اپنی تخلیقات میں ہر قسم کی اور ہر طبقے کی زبان کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے انسانوں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے نیز انہیں انسانی نفسیات پر بھی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی سبھی تخلیقات میں اپنے کرداروں کے معیار کے مطابق اور ان کی حیثیت کے مطابق ہی زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں نثر کی جگہ شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے۔ انہوں نے اکثر اپنی تخلیقات میں شگفتہ اور شاعرانہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں ہمیں ایسی اکثر خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں جن خصوصیات کو ہم کسی شعری تخلیق میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی نثر میں تشبیہ اور استعارے کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں اور اشارے کنایے کا استعمال بھی ملتا ہے۔ علامت کو انہوں نے کئی تخلیقات میں کافی خوبصورتی کے ساتھ

استعمال کیا ہے اور وہ باتیں یا وہ حقائق جو براہِ راست کہنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی ایسے حقائق اور معاملات کو انہوں نے علامتی انداز میں نہایت ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نقادوں نے نیز کرشن چندر کے اکثر معاصرین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کرشن چندر نثر میں بھی شاعری کرتے ہیں یعنی ان کی نثر اس قدر شگفتہ ہے کہ نثر پڑھتے ہوئے بھی شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ان کی نثر میں وہ سبھی خصوصیات دیکھنے کو مل جاتی ہیں جو خصوصیات جدید اور مابعد جدید ادیبوں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ اپنی اکثر تخلیقات میں کرشن چندر موسم کو بھی حالات کے مطابق ڈال لیتے ہیں مثلاً اگر ان کا ہیرو کسی مشکل میں پڑ جاتا ہے تو ایک دم آسمان پر کالے بادل چھا جاتے ہیں اور چاروں طرف اندھیرا ہو جاتا ہے یا اگر ان کا ہیرو کامیاب ہو جاتا ہے تو اچانک موسم بھی رومانی ہو جاتا ہے۔ ہوا سیٹیاں بجانے لگتی ہے، درخت مستی میں جھومنے لگتے ہیں، پھول کھل اٹھتے ہیں وغیرہ۔ اس طرح کرشن چندر کا ایک مخصوص انداز بیان ہے اور شگفتہ و شاعرانہ زبان ہے۔ انہیں ہر قسم کی زبان پر قدرت حاصل ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔ اردو ادب کے اکثر علماء و ناقدین نے ان کی شاعرانہ زبان کا اعتراف بھی کیا ہے اور ان کی زبان و اسلوب پر رشک بھی کیا ہے۔

کرشن چندر کی خامیاں

کوئی بھی انسان خوبیوں اور خامیوں دونوں ہی کی وجہ سے انسان ہوتا ہے ورنہ اگر خامیاں نہ ہوں اور صرف خوبیاں ہوں تو ہر انسان فرشتہ بن جائے۔ اس لیے انسانی زندگی خوبیوں اور خامیوں کی آمیزش سے عبارت ہے۔ اسی طرح ہر فنکار اور فن میں بھی خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود ہوتی ہیں۔ اب کسی فنکار یا فن کی عظمت کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ اس میں خامیاں کتنی کم ہیں اور خوبیاں کتنی زیادہ ہیں۔ کرشن چندر کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے یا تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت سی

خوبیوں کے ساتھ ساتھ چند معمولی خامیوں کا بھی احساس ہوتا ہے جن کا ذکر کرنا بھی یہاں ضروری ہے۔ ان کے افسانے ''محبت کی پہچان'' میں چار سال کا بچہ رات کے وقت اکیلا ایک ویران جگہ پر افسانے کے اہم کردار وقار کو ملتا ہے اور کسی خاص موضوع پر گفتگو کرتا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ معصوم بچہ آدھی رات اس ویران جگہ کیوں اور کیسے گیا نیز فقط چار سال کا بچہ اس قسم کی دانش مندی کی گفتگو کیسے کر سکتا ہے۔ افسانے میں اس معصوم بچے کا ایسی ویران جگہ پر اکیلے پایا جانا اور اس کی زبان سے اس قدر دانش مندی کے مکالمے ادا ہونا یا ادا کرانا بالکل غیر فطری یا مافوق الفطری محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح افسانے ''اشوک کی موت'' میں زمانہ ماضی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا ہے کہ ''اس وقت تین آنے سیر دودھ اور گھی روپیے کا چھے سیر ملتا تھا'' یعنی دودھ روپیے کا پانچ سیر اور گھی روپیے کا چھے سیر۔ اب یہ قیمتیں کہاں تک فطری ہو سکتی ہیں اس بات کا اندازہ ہر انسان بخوبی لگا سکتا ہے۔ اسی طرح ناول ''پانچ لوفر'' میں جمنا جو ایک فٹ پاتھ پر رہنے والی طوائف تھی ایک ہی رات میں فلمی دنیا میں پہونچ جاتی ہے اور ہزاروں کی مالک بن جاتی ہے یا پھر اسی ناول میں جب جمنا ہوائی جہاز میں بیٹھتی ہے اور جہاز اُڑتا ہے تو جمنا اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز سے اپنا فٹ پاتھ دیکھتی ہے۔ ایسی باتیں بھی حقیقت سے بعید اور غیر فطری ہیں جن کی ناول یا افسانے میں گنجائش نہیں اور جنہیں ہم ان کی خامیوں سے ہی تعبیر کریں گے۔ اسی ناول ''پانچ لوفر'' میں ایک اور قابل غور معاملہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب جمنا کو فلیٹ ملتا ہے تو اس فلیٹ کے بارے میں کرشن چندر لکھتے ہیں کہ ''بہت بڑا فلیٹ تھا، سات خواب گاہوں والا، گیارہ غسل خانوں والا اور چھپن روشنیوں والا، سنا ہے اس فلیٹ میں کئی لاکھ کا فرنیچر اور پچھتر ہزار کے صرف پردے آئے تھے'' یہاں بھی یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ایسا فلیٹ ہو سکتا ہے یا سات کمروں میں گیارہ غسل خانے ہو سکتے ہیں یا سات خواب گاہوں والا فلیٹ پایا

جانا فطری بات ہے۔ یا اس فلیٹ میں پچھتر ہزار کے پردے لگانے کی گنجائش ہے۔ یہ سبھی باتیں بھی صاف طور پر غیر فطری دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح ناول ''زرگاؤں کی رانی،، میں رانی صاحبہ اپنے خاوند کا قتل کرتی ہیں اور دو کروڑ روپیے دے کر بری ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ رانی صاحبہ کی ساری ریاست دو کروڑ کی نہیں ہے۔ یہ دو کروڑ روپیہ آیا کہاں سے اور اتنی رقم ہضم کیسے کر لی گئی۔ ایسی باتیں اور ایسے واقعات غیر فطری اور حقیقت سے بعید ہیں جنہیں کرشن چندر کی خامیوں میں ہی شمار کیا جا سکتا ہے۔ کشمیر کے حوالے سے ان کی تخلیقات میں مکانی اعتبار سے نشاندہی میں بھی چند چھوٹی چھوٹی غلطیاں ملتی ہیں۔ اسی طرح وادی کشمیر کی تہذیب اور ریاست پونچھ یا خطہ پیر پنجال کی تہذیبی خصوصیات کو انہوں نے ایک دوسرے میں شامل کر دیا ہے۔ مثلاً ناول ''شکست،، میں جب تحصیلدار صاحب کی لیتری (یعنی گروہ بن کر گھاس کاٹنا) ہوتی ہے تو ڈھول بج رہے ہیں اور یہاں ڈھول کے آگے عورتیں بھی گھاس کاٹ رہی ہیں، جبکہ اس تہذیب میں یا اس سماج میں عورتوں کا ڈھول کے آگے آنے کا تصور نہ ہی ماضی میں تھا اور نہ ہی اب ہے۔ اس کے علاوہ املا کے حوالے سے بھی ان کی تخلیقات میں چند چھوٹی چھوٹی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مذکورہ تمامی خامیوں کی وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر بسیار نویس تھے اور بسیار نویسی کی وجہ سے انہوں نے اپنی اکثر تخلیقات پر نظر ثانی نہیں کی۔ اگر اپنی تخلیقات پر انہوں نے بار بار غور و فکر کی ہوتی اور انہیں سنوارا ہوتا تو شاید ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں کا ہمیں احساس نہ ہوتا۔ الغرض ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی کرشن چندر کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی فنی یا فنکارانہ خوبیوں کے سامنے ان چند کوتاہیوں کا سرخم نظر آتا ہے نیز ان کی فنکارانہ خوبیوں کے سامنے ان معمولی سی چند خامیوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

کرشن چندر کا معیار و مقام

اردو فکشن کی تاریخ میں کرشن چندر کا نام و مقام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بے شک ہم سب پریم چند کی عظمت کے قائل ہیں لیکن بہت جگہوں پر کرشن چندر پریم چند سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ کرشن چندر کی تخلیقات میں ہمیں نذیر احمد کے ناولوں جیسی سماجی اصلاح بھی ملتی ہے نیز ''فسانہ آزاد'' اور ''امراؤ جان ادا'' کی طرح تہذیب واقدار کا بحران بھی ملتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں ہمیں ترقی یافتہ اور معیاری رومانیت بھی ملتی ہے نیز اشتراکی حقیقت نگاری بھی بلکہ ان کے ہاں رومانیت اور حقیقت دونوں ایک ہی جگہ شیر وشکر ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ہاں سماجی مسائل بھی ملتے ہیں اور جنسی معاملات کی شاندار عکاسی بھی ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں ہمیں امراء طبقہ بھی ملتا ہے اور طوائف کلچر بھی اپنی آب وتاب اور بے بسی و بدحالی کے ساتھ جلوہ گر ہے نیز ان کے ہاں کالو بھنگی، کچرا بابا اور دانی جیسے انسانیت پرست اور بے بس انسان بھی مل جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم فن کے حوالے سے بات کریں تو ان کے ہاں مختلف فنی تجربات بھی بخوبی ملتے ہیں۔ انہوں نے ناول وافسانے کے روایتی اصولوں کو اپنی کہانیوں میں اپنایا اور برتا بھی ہے نیز انہیں توڑ کر نیست ونابود بھی کیا ہے۔ ان کے ہاں ہمیں روایتی اور پلاٹ کی پابند کہانیاں بھی ملتی ہیں اور تجریدی وعلامتی کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ہمیں موضوعاتی رنگارنگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے نیز بہت سے کامیاب فنی تجربات بھی ان کے ہاں موجود ہیں جو اردو فکشن کو کرشن چندر کی دین ہیں۔ ان کی نثر میں شعری زبان اور شعری خصوصیات کا استعمال بھی ملتا ہے اور عام سادہ رواں دواں زبان کا استعمال بھی ملتا ہے۔ ان کا راوی کبھی کوئی گدھا ہوتا ہے اور کبھی دس روپے کا نوٹ یا کبھی ریل گاڑی ان کا راوی بن کر ہندوستانی سماج کے تلخ حقائق اور انسانیت شکن واقعات کو پیش کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ عمومی طور پر کرشن چندر کی تخلیقات میں

اور خصوصاً ان کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع بھی پایا جاتا ہے اور بہت سے کامیاب فنی تجربات بھی پائے جاتے ہیں۔ کرشن چندر بے شک اشتراکی تھے لیکن انہوں نے اشتراکیت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس لیے ہم کرشن چندر کو کسی ایک نظریے یا کسی ایک ادبی حلقے کے ساتھ نہیں جوڑ سکتے۔ کرشن چندر اگر ترقی پسند و اشتراکی ہیں تو یہ جدید بھی ہیں کیونکہ ان کے ہاں جدیدیت کی خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں، یہ مابعد جدید بھی ہیں کیونکہ مابعد جدیدیت کی فنی خصوصیات اور موضوعاتی شعور بھی ان کے ہاں موجود ہیں، یہ رومانی بھی ہیں کیونکہ ان کی اکثر تخلیقات پر رومانی فضا طاری ہے اور اگر نہیں تو کچھ بھی نہیں کیونکہ انہیں کسی خاص ادبی طبقے یا تحریک ورجحان سے جوڑنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ مختصر یہ کہ ان کے ہاں جو فنی و موضوعاتی خصوصیات موجود ہیں یہ خصوصیات دیگر مصنفین یا ادیبوں کے ہاں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس لیے کرشن چندر ایشیاء کے عظیم فنکار اور ایشیاء کے عظیم افسانہ نگار بھی ہیں اور اپنے معاصرین میں ایک خاص اہمیت وانفرادیت کے حامل بھی ہیں۔ اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ نیز چند غیر افسانوی اصناف (جن میں رپورتاژ اور سفرنامہ خصوصی طور پر شامل ہیں) کی تاریخ کرشن چندر کے ذکر کے بغیر اور ان کی تخلیقات کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ کرشن چندر کی نیز ان کی تخلیقات کی اہمیت وعظمت کا اعتراف اکثر قارئین وناقدین نے بھی کیا ہے۔

حواشی

۱۔ کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، ص ۶۱۱، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۳ء

۲۔ کرشن چندر کی رپورتاژ نگاری، سلمان فیصل، ص ۱۱۱، مشمولہ ہمارا ادب، کرشن چندر نمبر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۱۴ء

۳۔ اردو ادب میں ایک نئی آواز، محمد حسن عسکری، ص ۲۸، مشمولہ کرشن چندر کے بہترین افسانے، مرتبہ ریوتی سرن شرما و اوپندر ناتھ، ایشیا پبلشر دہلی، ۲۰۰۴ء

۴۔ اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب، پروفیسر قمر رئیس، ص ۱۵۹، کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی، ۲۰۰۴ء

۵۔ کرشن چندر کے افسانے میں فنی حسن، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ص ۵۴، مشمولہ ہمارا ادب، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۱۴ء

۶۔ کرشن چندر اور ترقی پسند افسانہ، مشعل سلطانپوری، ص ۶۵، مشمولہ ہمارا ادب، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۱۴ء

۷۔ اردو ادب میں ایک نئی آواز، محمد حسن عسکری، ص ۴۱، مشمولہ کرشن چندر اور ان کے افسانے، مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء

۸۔ کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری، شکیب نیازی، ص ۲۲۰، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دلی، ۱۹۹۵ء

۹۔ کرشن چندر کچھ تاثرات، احتشام حسین، ص ۳۰، مشمولہ کرشن چندر اور ان کے افسانے، مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء

۱۰۔ میری یادوں کے چنار، کرشن چندر، ص ۲۹۳-۲۹۲، ایشیا پبلشرز، دہلی، ۱۹۶۲ء

۱۱۔ مٹی کے صنم، کرشن چندر، ص ۱۴، یونین پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۶۶ء

۱۲۔ زندگی کے موڑ پر، کرشن چندر، ص ۱۱۰، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۴۳ء
۱۳۔ کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری، شکیب نیازی، ص ۱۷۰، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دلی، ۱۹۹۵ء
۱۴۔ اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب، پروفیسر قمر رئیس، ص ۱۵۳، کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی، ۲۰۰۴ء
۱۵۔ کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری، شکیب نیازی، ص ۲۹۷، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دلی، ۱۹۹۵ء

گوجری و پہاڑی الفاظ کی فرہنگ

یہاں کرشن چندر کی تخلیقات میں استعمال شدہ ایسے الفاظ کی ایک فہرست دی جارہی ہے جو خطہ پیر پنجال (خصوصاً پونچھ و راجوری) کی مقامی زبانوں گوجری اور پہاڑی کے الفاظ ہیں۔ گوجری و پہاڑی زبانوں میں ان الفاظ کا عام استعمال ہوتا ہے جبکہ اردو میں ان میں سے کچھ الفاظ متروک ہو چکے ہیں اور کچھ الفاظ ایسے ہیں جو اردو لغت میں شامل نہیں ہیں بلکہ خطۂ پیر پنجال کی مقامی زبانوں (یعنی گوجری و پہاڑی) کے الفاظ ہیں۔ کرشن چندر نے ان الفاظ کا اپنی تخلیقات میں کثرت سے استعمال کیا ہے۔ یہاں ان الفاظ کی فہرست تیار کرنے اور ان کے معانی کی وضاحت کرنے کا مقصد کرشن چندر کی تخلیقات کی تفہیم کو آسان بنانا ہے کیونکہ خطہ پیر پنجال سے تعلق رکھنے والا قاری تو ان الفاظ کے معانی باآسانی سمجھ سکتا ہے لیکن دیگر (بیرون خطہ کے رہنے والے) قارئین کے لیے ان الفاظ کی تفہیم ایک بڑا مسئلہ ہے۔ کرشن چندر کی تخلیقات میں استعمال شدہ ان الفاظ کی فہرست اور ان کے معانی کے حوالے سے بہ اعتبار حروف تہجی وضاحت حسب ذیل ہے :

اڈی کھوڑا لگانا	ٹانگ میں ٹانگ ڈال کر دوسرے کو گرانا
اَک	ایک چھوٹے سے پودے کا نام، اس کا پتہ توڑنے سے اس میں سے دودھ جیسا سفید رَس نکلتا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ پودا دوائی بنانے میں کام آتا ہے
اَل	ایک سبزی کا نام، اس کو مختلف طریقوں سے کھانے میں استعمال کیا جاتا ہے، عام طور پر اَل کو چاولوں میں ڈال کر اور اس میں گڑ وغیرہ ڈال کر میٹھے چاول تیار کیے جاتے ہیں

باولی	اردو میں یہ لفظ مونث کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی پاگل یا دیوانی کے ہیں، گوجری و پہاڑی زبانوں میں باولی سے مراد قدرتی پانی کا چشمہ ہے
بُنگی	ناشپاتی کی طرح کا اور ناشپاتی سے چھوٹا ایک میٹھا پھل
بٹوہ	پیسے رکھنے کا پرس، مردانہ پرس
بکروٹا	بکری کا بچہ
بنجلی	ایک قسم کی دیسی بانسری، ہاتھ سے بنائی گئی بانسری
بہی	سیب کی طرح کا ایک پھل جو ذائقے میں سیب سے کم میٹھا اور ذرا پھیکا ہوتا ہے
بیکڑ	ایک چھوٹا سا جھاڑی نما پودا جس کے پتّوں میں کچّے کیلے رکھ کر تیار کیے جاتے ہیں
بینی پکڑنا	ایک کھیل جس میں ایک دوسرے کا بازو پکڑا اور چھڑایا جاتا ہے، طاقت آزمانے کا ایک طریقہ، یہ کھیل اکثر شادی بیاہ کے موقعوں پر کھیلا جاتا ہے
پونچھ	ایک جگہ کا نام جو آزادی سے پہلے یا تقسیم سے پہلے ایک ریاست تھی لیکن اب اس کی حیثیت ریاست جموں وکشمیر کے ایک ضلع کی ہے، اب یہ علاقہ آدھا پاکستان کے قبضے میں ہے اور آدھا ہندوستان کے قبضے میں ہے
پہاڑی قبائلی طبقہ	وہ لوگ جو اکثر اونچے اونچے پہاڑوں میں جدید سہولیات کے بغیر قدیم طرز حیات پر جی رہے ہیں، یہ لوگ اکثر اپنے مال مویشی کے ساتھ کھلے آسمان تلے رہتے ہیں اور رہنا پسند کرتے ہیں، ان کا کوئی مکمل ٹھکانا نہیں ہوتا (چرواہے، گجر بکروال طبقہ)
پھگاڑا	انجیر کی طرح کا ایک پھل جو انجیر سے چھوٹا اور رنگ میں کالا ہوتا ہے، جنگلی انجیر

پیر پنجال	ایک پہاڑی سلسلے کا نام جو پونچھ و راجوری اور شوپیاں اضلاع کے درمیان ہے، اس پہاڑی سلسلے کی نسبت سے راجوری اور پونچھ اضلاع کو خطہ پیر پنجال کہا جاتا ہے، یہ پہاڑی سلسلہ صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر کے درمیان حد فاصل کا کام کرتا ہے
تراڑ	پتلا اور لمبا چوڑا پتھر کا ٹکڑا، ٹائل نما پتھر کا ٹکڑا
ترڑی	کھیرے کی ایک قسم جو سفید، کھیرے سے بڑی اور لذیز ہوتی ہے
تلّہ	اُردو لغت میں اس لفظ کے معنی پرندے پکڑنے والے جھال کے ہیں جبکہ پونچھ کی مقامی زبانوں میں تلّہ کے معنی 'میدان یا ایسی میدانی جگہ جہاں کھیلا جا سکے، کے ہیں
تنبر	خطہ پیر پنجال کے جنگلوں میں پایا جانے والا ایک کانٹے دار پودا جس کا پھل دانے دار اور تیکھا ہوتا ہے، اس کے دانے اکثر چٹنی بنانے کے کام آتے ہیں
تُنگ	ایک پیڑ کا نام جو بہت زیادہ اونچا اور بالکل سیدھا ہوتا ہے، اس کی لکڑی عمارت میں کام آتی ہے
تھور	اُردو میں تھور کے معنی زمین کے کھاراپن کے ہیں جبکہ گوجری و پہاڑی زبانوں میں تھور اس خار دار پیڑ یا پودے کا نام ہے جسے انگریزی میں cactus کہتے ہیں
ٹانڈا	مکّی کا گنّا یا مکّی کا پودا
جھڑی	لگاتار بارش، کئی دنوں سے ہو رہی بارش
جَھنڈ	اُردو میں اس کے معنی 'ایسا درخت جس کی لکڑی جلانے کے کام آتی ہے' کے ہیں لیکن پونچھ کی مقامی زبانوں میں جھنڈ مختلف قسم کی کانٹے دار جھاڑیوں کو کہا جاتا ہے

جھولا	کپڑے کا بنا ہوا تھیلا جو کندھے سے لگایا یا لٹکایا جاتا ہے
جینگن	چیڑ کے درخت سے نکلنے والا یا نکالا جانے والا وہ رس جس کو آگ بہت جلدی پکڑتی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس جینگن کو کپڑے تیار کرتے ہوئے فیکٹریوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔اس کی مہک بہت خوشبودار ہوتی ہے
چیڑ	ایک بالکل سیدھا اور کافی اونچا درخت جس کی لکڑی عمارت بنانے میں بھی کام آتی ہے نیز جلانے میں بھی کام آتی ہے
دُھند	اردو لغت میں دُھند کے معنی 'تاریکی یا دُھندلا ہونا' کے ہیں جبکہ گوجری و پہاڑی زبانوں میں دُھند ان سفید بادلوں کو کہتے ہیں جو زمین سے نکل کر علاقے کو گھیر لیتے ہیں اور سفیدی کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا
دھیال	دھان کی فصل سے دھان نکال لینے کے بعد جو گھاس پھوس بچ جاتا ہے اسے دھیال کہتے ہیں، اس دھیال سے رسیاں، چٹائیاں اور دیگر روزمرہ استعمال کی چیزیں بنائی جاتی ہیں
دینیاں	چیڑ کے پیڑ کے تنے کی وہ لکڑیاں جنہیں بہت جلدی آگ پکڑتی ہے، پہاڑی علاقوں میں ان کو جلا کر روشنی پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے، برقی یا شمسی روشنیوں سے پہلے خطہ پیر پنجال میں ان دینیوں کو ہی استعمال کر کے روشنی کی جاتی تھی
ڈاب	اردو لغت کے اعتبار سے ڈاب کے معنی ایسی جگہ کے ہیں جہاں پانی اکٹھا ہو لیکن گوجری اور پہاڑی زبانوں میں ڈاب ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو بہتے ہوئے دریا یا نالے میں گہری جگہ ہو، ایسی جگہوں پر نہایا اور تیرا جاتا ہے

ڈانگ	اُردو میں اس کے معنی لاٹھی کے ہیں جبکہ مقامی زبانوں میں ڈانگ خصوصی طور پر لڑائی میں استعمال ہونے والی لاٹھی اور لاٹھی سے مارنے کو کہا جاتا ہے
ڈنگر	اردو لغت میں اس کے معنی حیوان کے ہیں جبکہ مقامی زبانوں میں ڈنگر صرف بیل اور گائے کو مجموعی طور پر کہا جاتا ہے
ڈھکّی	اردو میں ڈھکی ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں شکار کی تاک لگا کر بیٹھا جاتا ہے لیکن مقامی زبانوں میں ڈھکی پہاڑوں کی کھڑی چڑھائی کو کہا جاتا ہے
ڈھوک	ڈھوک پیر پنجال کے پہاڑوں میں موجود ان جگہوں کو کہا جاتا ہے جہاں مال مویشی اور بکریاں لے کر لوگ چھ مہینے بسر کرتے ہیں، یہاں موسم گرما میں بھی ٹھنڈی اور جان افروز فضا میسّر رہتی ہے
رت گلے	جنگلی مرغے
رکھ یا سرکاری رکھ	رکھ یا سرکاری رکھ ایسے جنگلوں کو کہا جاتا ہے جو مہاراجہ کے زمانے میں راجہ مہاراجہ اور امراء کے شکار کھیلنے کے لیے مخصوص تھے، ان جنگلوں میں عام انسان کو جانے کی اجازت نہیں تھی
سٹلّا	چھپکلی کی ایک قسم
سُکھڑ	کوئی بھی چیز بالکل کھڑی ہونا، ذرا بھی ترچھی نہ ہونا، بالکل کھڑی چڑھائی
سنبھلو	ایک قسم کا جنگلی پھل جو بالکل گندم کے دانے کی طرح ہوتا ہے لیکن رنگ میں پہلے ہرا ہوتا ہے اور جب تیار ہو جائے تو اس کا رنگ کالا ہو جاتا ہے
سنتھا	ایک جھاڑی نما پودا، یہ پودا کچّے مکانوں کی چھت تیار کرنے میں کام آتا ہے
کاؤ	ایک پیڑ کا نام جو زیتون کے پیڑ کی طرح ہوتا ہے، جنگلی زیتون

کائی	اردو لغت میں کائی ایک پانی میں اگنے یا پائی جانے والی سبزی کو کہا جاتا ہے لیکن مقامی زبانوں میں کائی کے معنی ایک خاص قسم کی گھاس کے ہیں
کریڑی	برف سے پہلے یا برف کے ساتھ گرنے والے باریک اولے
کڑچھی	کھانا بنانے میں استعمال ہونے والا چمچہ
کڑی	اردو لغت کے اعتبار سے کڑی کے معنی مشکل کے ہوتے ہیں لیکن گوجری و پہاڑی زبانوں میں کڑی لکڑی کے اس شہتیر کو کہا جاتا ہے جو کچّے مکان کے چھت میں ڈالا جاتا ہے، مقامی زبانوں میں کڑی سے مراد ایک خاص قسم کا سالن بھی ہوتا ہے جو لسّی سے تیار کیا جاتا ہے
کسّی	پہاڑی علاقوں میں قدرتی بنی ہوئی نالی جس میں سے بارش کا پانی بہتا ہے
کلاڑی	دودھ سے بنائی گئی ایک روٹی، اس کا ذائقہ پنیر جیسا ہوتا ہے اور کھانے کے ساتھ کھائی جاتی ہے
کھڑک	ایک پیڑ کا نام جس کے پتّے جانوروں کے کھانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں
کھل	بھیڑ یا بکری کی کھال اتار کر اسے اس طریقے سے تیار کیا جاتا ہے تا کہ یہ کھال مکی یا گیہوں ڈال کر چکی تک لے جانے کے قابل بن جائے، ایسی کھال کو کھل کہا جاتا ہے
گہل	جانوروں کے لیے بنایا گیا ایسا راستہ جس راستے پر چلتے ہوئے جانور اِدھر اُدھر نہ بھٹک سکیں، جانوروں کے لیے بنایا گیا خصوصی راستہ
لپنا	مٹی میں پانی ڈال کر اور اس مٹی سے پتھر کی بنی دیواروں پر لیپ لگانا

لیتری	اردو لغت میں لیتری کے معنی 'گھاس کاٹنا یا کٹائی' کے ہیں جبکہ گوجری و پہاڑی زبانوں میں گروہ بن کر گھاس یا فصل کاٹنے کو لیتری کہا جاتا ہے
مالٹا	سنگترے کی طرح کا ایک پھل جو سنگترے سے ذرا کھٹا ہوتا ہے
مخول کرنا	مذاق کرنا
ملوک	ایک پھل جو شکل میں چھوہارے جیسا اور چھوہارے سے کم موٹا ہوتا ہے، اردو میں اسے املوک کہا جاتا ہے
منّوں	ایک پیڑ جس کا سایہ گہرا اور ٹھنڈا ہوتا ہے، اس کی لکڑی وزن میں ہلکی اور مضبوط ہوتی ہے
وادی	صوبہ کشمیر کا پورا میدانی علاقہ وادی کہلاتا ہے
ہل	انگریزی میں ہل سے مراد پہاڑی یا پہاڑی علاقہ ہوتا ہے جبکہ گوجری پہاڑی زبانوں میں ہل اونچے پہاڑوں کے درمیان پائی جانے والی گہری جگہ یا ایسی گہرائی میں پائے جانے والے کھیتوں کو کہا جاتا ہے

کتابیات

بنیادی ماخذ

ناول

نمبر شمار	مصنف/مرتب	کتاب کا نام	ناشر/مطبع	مقام	سن اشاعت
۱	کرشن چندر	شکست	ساقی بک ڈپو	دلّی	۱۹۴۳ء
۲	کرشن چندر	مٹی کے صنم	یونین پرنٹنگ پریس	دلّی	۱۹۶۶ء
۳	کرشن چندر	میری یادوں کے چنار	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۲ء
۴	کرشن چندر	ایک عورت ہزار دیوانے	بیسویں صدی	دلّی	۱۹۶۵ء
۵	کرشن چندر	چاندی کا گھاؤ	فوٹو آفسیٹ پریس	دلّی	۲۰۰۰ء
۶	کرشن چندر	برف کے پھول	فوٹو آفسیٹ پریس	دلّی	۲۰۰۰ء
۷	کرشن چندر	ایک وائلن سمندر کے کنارے	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۳ء
۸	کرشن چندر	اس کا بدن میرا چمن	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۷۷ء
۹	کرشن چندر	آئینے اکیلے ہیں	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۹۹ء
۱۰	کرشن چندر	دوسری برف باری سے پہلے	شاعر۔کرشن چندر نمبر (مشمولہ)	بمبئی	۱۹۶۷ء
۱۱	کرشن چندر	زرگاؤں کی رانی	شمع بک ڈپو	دلّی	۱۹۶۶ء
۱۲	کرشن چندر	سونے کا سنسار	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۵۴ء
۱۳	کرشن چندر	فلمی قاعدہ	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۶ء
۱۴	کرشن چندر	گنگا بہے نہ رات	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۹۹ء
۱۵	کرشن چندر	لندن کے سات رنگ	ایشیا پبلشرز	دلّی	۲۰۰۰ء
۱۶	کرشن چندر	سپنوں کی وادی	مونی پرنٹنگ پریس	دلّی	۲۰۱۴ء

۱۷	کرشن چندر	محبت بھی قیامت بھی	....	....	....
۱۸	کرشن چندر	الٹا درخت	ایشیا پبلشرز	دلّی	....
۱۹	کرشن چندر	ہمارا گھر	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۶ء
۲۰	کرشن چندر	ستاروں کی سیر	مکتبہ جامعہ بہ اشتراک قومی کونسل	دلّی	۲۰۱۳ء
۲۱	کرشن چندر	دادر پُل کے بچّے	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۱ء
۲۲	کرشن چندر	ہونولولو کا راجکمار	اہلوالیہ بک ڈپو	دلّی	....
۲۳	کرشن چندر	غدار	اراولی پبلشرز	دلّی	۲۰۰۵ء
۲۴	کرشن چندر	لال تاج	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۶ء
۲۵	کرشن چندر	دل کی وادیاں سوگئیں	بیسویں صدی	دلّی	۱۹۷۷ء
۲۶	کرشن چندر	پانچ لوفر	پنجابی پستک بھنڈار	دلّی	۱۹۶۶ء
۲۷	کرشن چندر	جب کھیت جاگے	بمبئی بک ہاؤس	بمبئی	۱۹۵۲ء
۲۸	کرشن چندر	ایک گدھے کی سرگزشت	شمع بک ڈپو	دلّی	۱۹۵۷ء
۲۹	کرشن چندر	گدھے کی واپسی	ایشیا پبلشرز	دلّی	۲۰۰۰ء
۳۰	کرشن چندر	ایک گدھا نیفا میں	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۴ء
۳۱	کرشن چندر	آسمان روشن ہے	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۵۷ء
۳۲	کرشن چندر	کارنیوال	اہلوالیہ بک ڈپو	دلّی	....
۳۳	کرشن چندر	آدھا راستہ	نصرت پبلشرز	لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۳۴	کرشن چندر	چنبل کی چنبیلی	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۷۳ء
۳۵	کرشن چندر	چندا کی چاندنی	اہلوالیہ بک ڈپو	دلّی	....

افسانوی مجموعے

۱	کرشن چندر	طلسم خیال	مکتبہ اُردو	لاہور	۱۹۳۸ء
۲	کرشن چندر	مزاحیہ افسانے	آزاد کتاب گھر	دلّی	۱۹۵۴ء
۳	کرشن چندر	گھونگھٹ میں گوری جلے	ساقی بک ڈپو	دلّی	۱۹۵۳ء
۴	کرشن چندر	نغمے کی موت	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۵۹ء
۵	کرشن چندر	کتاب کا کفن	بیسویں صدی	دلّی	۱۹۵۶ء
۶	کرشن چندر	شہزادہ	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۹۶ء
۷	کرشن چندر	یوکلپٹس کی ڈالی	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۵۹ء
۸	کرشن چندر	ایک روپیہ ایک پھول	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۵۹ء
۹	کرشن چندر	کانچ کے ٹکڑے	....	....	....
۱۰	کرشن چندر	نئے افسانے	ایشیا پبلشرز	دلّی	....
۱۱	کرشن چندر	نظارے	ادبی دنیا	لاہور	۱۹۴۰ء
۱۲	کرشن چندر	زندگی کے موڑ پر	مکتبہ اردو	لاہور	۱۹۴۳ء
۱۳	کرشن چندر	ہوائی قلعے	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۹۶ء
۱۴	کرشن چندر	اَن داتا	مکتبہ جامعہ بہ اشتراک قومی کونسل	دلّی	۲۰۱۳ء
۱۵	کرشن چندر	ٹوٹے ہوئے تارے	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۹۵ء
۱۶	کرشن چندر	پرانے خدا	عبدالحق اکیڈمی	حیدرآباد	۱۹۴۴ء
۱۷	کرشن چندر	تین غنڈے	انڈین بک کمپنی	دلّی	۱۹۴۸ء
۱۸	کرشن چندر	سمندر دور ہے	نوہند پبلشرز	بمبئی	۱۹۴۸ء

۱۹	کرشن چندر	کشمیر کی کہانیاں	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس	الہ آباد	۱۹۴۹ء
۲۰	کرشن چندر	نئے غلام	مکتبہ اردو	لاہور	۱۹۵۳ء
۲۱	کرشن چندر	دسواں پُل	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۴ء
۲۲	کرشن چندر	گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۶۷ء
۲۳	کرشن چندر	الجھی لڑکی کالے بال	ادبی ٹرسٹ	حیدر آباد	۱۹۷۰ء
۲۴	کرشن چندر	پشاور ایکسپریس	انجمن ترقی اردو	لاہور	۱۹۹۳ء
۲۵	کرشن چندر	کبوتر کے خط	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۹۶ء
۲۶	کرشن چندر	پھول کی تنہائی	مکتبہ اردو	لاہور	....
۲۷	کرشن چندر	مسرّت	ایشیا پبلشرز	دلّی	۱۹۹۱ء
۲۸	کرشن چندر	کھٹے انار میٹھے انار	اراولی پبلشرز	دلّی	۲۰۰۰ء
۲۹	کرشن چندر	ایک گرجا ایک خندق	قادری پریس	بمبئی	۱۹۴۸ء
۳۰	کرشن چندر	آدھے گھنٹے کا خدا، پورے چاند کی رات، خمیازہ، علی آباد کی سرائے، تائی ایسری، ایرانی پلاؤ، پیاسا (مشمولہ۔ ہمارا ادب)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز	جموں/ سرینگر	۲۰۱۴ء

ڈرامے

۱	کرشن چندر	دروازہ	اردو اکیڈمی	لاہور	....
۲	کرشن چندر	دروازے کھول دو	نصیر بک ڈپو	جے پور	۲۰۱۰ء

۳	کرشن چندر	ہم سب غلیظ ہیں (مشمولہ۔ نغمے کی موت)	ایشیا پبلشرز	دلی	۱۹۵۹ء
۴	کرشن چندر	پھٹا لحاف (مشمولہ۔ کانچ کے ٹکڑے)	....	......	......
۵	کرشن چندر	رشتے کی ضرورت (مشمولہ۔ کانچ کے ٹکڑے)	....	......	......
٦	کرشن چندر	کُتّے کی موت (مشمولہ۔ یوکلپٹس کی ڈالی)	ایشیا پبلشرز	دلی	۱۹۵۹ء
۷	کرشن چندر	بدصورت راجکماری (مشمولہ۔ گونگھٹ میں گوری جلے)	ساقی بک ڈپو	دلی	۱۹۵۳ء
۸	کرشن چندر	جھاڑو (مشمولہ۔ مزاحیہ افسانہ)	آزاد کتاب گھر	دلی	۱۹۵۴ء
۹	کرشن چندر	ایک روپیہ ایک پھول (مشمولہ۔ ایک روپیہ ایک پھول)	ایشیا پبلشرز	دلی	۱۹۵۹ء
۱۰	کرشن چندر	عشق کے بعد (مشمولہ۔ کتاب کا کفن)	بیسویں صدی	دلی	۱۹۵٦ء
۱۱	کرشن چندر	کتاب کا کفن (مشمولہ۔ کتاب کا کفن)	بیسویں صدی	دلی	۱۹۵٦ء

۱۲	کرشن چندر	منگلیک (مشمولہ۔ نظارے)	ادبی دنیا	لاہور	۱۹۴۰ء
۱۳	کرشن چندر	دلی کے دائرے (مشمولہ۔ نئے افسانے)	ایشیا پبلشرز	دلی	......

رپورتاژ

۱	کرشن چندر	لاہور سے بہرام گلہ تک (مشمولہ۔ طلسمِ خیال)	مکتبہ اردو	لاہور	۱۹۳۸ء
۲	کرشن چندر	پودے	مکتبہ سلطانی	بمبئی	۱۹۴۷ء
۳	کرشن چندر	صبح ہوتی ہے	کتب پبلشرز	بمبئی	۱۹۵۰ء

سفرنامہ

۱	کرشن چندر	ورق ورق کھوگئی زندگی میری	(مشمولہ) شخصیت وفن۔ مہندرناتھ یادگار نمبر	بمبئی	۱۹۷۵ء

ثانوی ماخذ

نمبر شمار	مصنف/مرتب	کتاب کا نام	ناشر/مطبع	مقام	سن اشاعت
۱	احمد حسن (ڈاکٹر)	کرشن چندر اور مختصر افسانہ نگاری	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۱۹۹۶ء
۲	اطہر پرویز	کرشن چندر اور ان کے افسانے	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۲۰۱۳ء
۳	اسلم آزاد (ڈاکٹر)	اردو ناول آزادی کے بعد	لکشمی پریس	نئی دلّی	۱۹۹۰ء

۴	اسلم جمشید پوری (ڈاکٹر)	اردو فکشن کے پانچ رنگ	عرشیہ پبلی کیشنز	دلّی	۲۰۱۷ء
۵	انور پاشا	ترقی پسند اردو ناول	پیش رو پبلی کیشنز	دلّی	۱۹۹۵ء
٦	اوپندر ناتھ/ ریوتی سرن شرما	کرشن چندر کے بہترین افسانے (مرتب)	ایشیا پبلشرز	دلّی	۲۰۰۴ء
۷	ایم۔ نسیم اعظمی (ڈاکٹر)	اردو کے چند فکشن نگار	اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس	دلّی	۲۰۱۵ء
۸	بیگ احساس (پروفیسر)	کرشن چندر: شخصیت اور فن	وسنتا گرافکس	حیدرآباد	۱۹۹۹ء
۹	جگدیش چندر ودھاون	کرشن چندر: شخصیت اور فن	کتابی دنیا	دلّی	۳۰۰۳ء
۱۰	جمال آرا نظامی	اردو میں افسانوی ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۸۴ء
۱۱	جیلانی بانو	ہندوستانی ادب کے معمار، کرشن چندر (مونوگراف)	ساہتیہ اکادمی	دہلی	۱۹۸٦ء
۱۲	خالد اشرف (ڈاکٹر)	برصغیر میں اردو ناول	کتابی دنیا	دلّی	۲۰۰۳ء
۱۳	خلیل الرحمٰن اعظمی	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۲۰۰۷ء

۱۴	روبینہ تبسم	اردو فکشن، تنقیدی تناظرات	ایجوکیشنل بک ہاؤس	دلّی	۲۰۱۷ء
۱۵	سید رفیق حسین	اردو ناول کی نشو ونما	لالہ رام دیال اگروال کٹڑہ	الہ آباد	۱۹۸۷ء
۱۶	شازیہ رئیس	شکست کا تنقیدی جائزہ	براؤن پبلی کیشنز	دلّی	۲۰۱۵ء
۱۷	شکیب نیازی	کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۱۹۹۵ء
۱۸	شہناز رحمٰن	اردو فکشن، تفہیم، تعبیر اور تنقید	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۲۰۱۶ء
۱۹	صغیر افراہیم (پروفیسر)	اردو ناول تعریف، تاریخ اور تجزیہ	براؤن بک پبلی کیشنز	نئی دلّی	۲۰۱۶ء
۲۰	عبدالسلام	کرشن چندر اور اشتراکیت	اعجاز پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۱۹۸۹ء
۲۱	عظیم الشان صدیقی (ڈاکٹر)	افسانوی ادب تحقیق و تجزیہ	نیو پبلک پریس	دلّی	۱۹۸۳ء
۲۲	عظیم الشان صدیقی (ڈاکٹر)	اردو ناول آغاز وارتقاء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۲۰۰۸ء
۲۳	علی احمد فاطمی	کرشن چندر، فکر وفن	انجمن ترقی اردو	دلّی	۲۰۱۴ء
۲۴	فخر الکریم (ڈاکٹر) مرتب	کرشن چندر افکار ونظریات	شارپ ٹریک	الہ آباد	۲۰۱۵ء

۲۵	قمر رئیس (پروفیسر)	اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب	کاک آفسیٹ پرنٹرس	دلّی	۲۰۰۴ء
۲۶	کے۔کے۔ کھلر	اردو ناول کا نگار خانہ	وجیتا آفسیٹ پرنٹرس	دلّی	۱۹۸۳ء
۲۷	گوپی چند نارنگ (پروفیسر)	فکشن شعریات: تشکیل وتنقید	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۲۰۰۹ء
۲۸	گوپی چند نارنگ (پروفیسر)	اردو افسانہ: روایت اور مسائل	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۲۰۱۳ء
۲۹	محمد اکرم خاں (ڈاکٹر)	آزادی کے بعد اردو ناولوں میں شہری زندگی	....	....	۲۰۱۴ء
۳۰	محمد حسن	معاصر ادب کے پیش رو	مکتبہ جامعہ	دلّی	۱۹۸۲ء
۳۱	محمد غیاث الدین	فنکار کرشن چندر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۲۰۰۵ء
۳۲	مشتاق احمد وانی (ڈاکٹر)	تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۲۰۰۷ء
۳۳	مہ جبین نجم (ڈاکٹر)	کرشن چندر کی ناول نگاری اور نسائی کردار	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	دلّی	۲۰۰۸ء
۳۴	نذیر قریشی	قلم و قرطاس	ازخود	....	۲۰۱۱ء
۳۵	نصرت چودھری	نبض افسانہ	انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز	دلّی	۲۰۰۲ء

۳۶	نند کشور وکرم	کرشن چندر (مونوگراف)	اردو اکادمی	دہلی	۲۰۱۴ء
۳۷	ہارون ایوب (ڈاکٹر)	اردو ناول پریم چند کے بعد	اردو پبلشرز لکھنؤ	لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۳۸	یوسف سرمست (ڈاکٹر)	بیسویں صدی میں اردو ناول	ترقی اردو بیورو	دلّی	۱۹۹۵ء

رسائل

نمبر شمار	نام رسالہ	مقام	سن اشاعت
۱	اردو دنیا	دہلی	نومبر ۲۰۱۴ء
۲	بے لاگ	سرینگر	ستمبر ۲۰۱۵ء
۳	بے لاگ	سرینگر	اکتوبر ۲۰۱۵ء
۴	شاعر۔کرشن چندر نمبر	بمبئی	۱۹۶۷ء
۵	شاعر۔کرشن چندر نمبر	بمبئی	۱۹۷۷ء
۶	فکر ونظر	علی گڑھ	دسمبر ۲۰۱۶ء
۷	ہمارا ادب۔کرشن چندر نمبر	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز	۲۰۱۴ء



KRISHAN CHANDER
(Hayaat Wa [illegible]bi Jihaat)

(۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء پونچھ —— ۸ مارچ ۱۹۷۷ء بمبئی)

QASMI KUTUB KHANA
E-92, Abul Fazal Enclave, Okhla New Delhi
Talab Khatikan, Jama Masjid, Jammu Tawi - 180001
Ph. 9797352280 | 7889903800
G-Mail:- qasmikutubkhana0729@gmail.com
Email:- info@qasmikutubkhana.store
website:- qasmikutubkhana.store

₹ 245/-
ISBN: 978-93-83033-75-1

